معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۲۰؍روپے فی شمارہ ۱۲؍روپے

پاکستان میں سالانہ ۳۰۰؍روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پچیس ۲۵ پونڈ یا چالیس ۴۰ ڈالر

بحری ڈاک نو ۹ پونڈ یا چودہ ۱۴ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحیٰی، شیر ستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج اسٹریچن روڈ، کراچی۔

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۱۵ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع ماہ کے تیسرے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

جلد ۱۷۲ ماہ رجب المرجب ۱۴۲۴ھ مطابق ماہ ستمبر ۲۰۰۳ء عدد ۳۔

فہرست مضامین

شذرات

''لڑاؤ اور حکومت کرو'' انگریزوں کی خاص پالیسی تھی، یہی طریقہ ان کے ہندوستان چھوڑنے اور آزادی ملنے کے بعد قومی حکومتوں نے بھی اختیار کیا جس کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں روز بہ روز تفرقہ واختلاف بڑھتا جارہا ہے بلکہ آزادی کے بعد حالات زیادہ خراب اور بدتر ہوگئے ہیں، دونوں قوموں کے تصادم اور ٹکراؤ کو ختم کرنے کی کبھی کوئی سنجیدہ کوشش بھی نہیں کی گئی اور اب ملک میں ایسی جارحیت پسند اور بے لگام فسطائی جماعتیں وجود میں آگئی ہیں جن کا مشغلہ ہی اختلاف وتفرقہ بڑھانا اور فرقہ وارانہ جنون، شروفساد اور نفرت وعصبیت کی آگ بھڑکانا ہے لیکن اس کے باوجود نہ ان پر کوئی قدغن ہے اور نہ بندش۔

اب ایسی ہی جماعتوں کا ملک پر قبضہ وتسلط ہے اور سیکلر کہلانے والی متعدد جماعتیں بھی اپنے مفاد کے لیے اور اقتدار کی لالچ میں ان کا ضمیمہ بن گئی ہیں، اس لیے فرقہ پرست اور رجعت پسند طاقتوں کو من مانی کرنے اور کھل کھیلنے کا زیادہ موقع مل گیا ہے اور انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو شدید نفرت اور دوری پیدا کردی ہے وہ مٹائے نہیں مٹ رہی ہے، ہندوؤں میں ذات پات کا جو نظام صدیوں سے قایم ہے، یہی عناصر اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے اسے بھی ہوا دے رہے ہیں اور مختلف گروہوں کی طبقاتی کشمکش کو بڑھا رہے ہیں، یہ صورت حال ملک وقوم کی آزادی، جمہوریت، وحدت وسالمیت، قومی یک جہتی، فرقہ وارانہ اتحاد، امن وامان اور ترقی وخوش حالی، ہر چیز کے لیے نہایت خطرناک ہے، گزشتہ پانچ چھ برسوں میں فرقہ وارانہ کشمکش، طبقہ واریت اور علاقائیت جس تیزی سے بڑھی ہے، اس کی مثال نہیں مل سکتی۔

اجودھیا کی بابری مسجد کا تنازع بھی اسی نوعیت کا ہے جس کو آزادی کے بعد بہ تدریج اس مرحلے تک پہنچا دیا گیا کہ ملک سے امن وامان مفقود ہوگیا اور یہ ہندو مسلم اختلاف ونفرت سے بھی آگے قتل وخوں ریزی کا باعث بن گیا، ہمارے نزدیک یہ سرے سے نزاعی مسئلہ تھا ہی نہیں لیکن اگر بالفرض نزاعی تھا بھی تو مسجد کے انہدام کا کیا جواز تھا، اس کی نوبت تو نزاع کے تصفیہ کے بعد آتی، یہ کارنامہ نہیں کھلا ہوا جرم، قانون شکنی اور دہشت گردی تھی جس میں آج کے وہ کتنے پارسا بھی ملوث تھے جو باہمی مذاکرات پر بڑا زور دے رہے ہیں، اس کا خیال مسجد گراتے وقت کیوں نہیں آیا، کیا اس لیے کہ گھوم گھوم کر ملک میں آگ کے شعلے بھڑکانے کا موقع نہ ملتا یا اس لیے کہ مسجد کا موجود وقایم رہنا گفت وشنید میں حایل بنتا؟ بی جے پی کے سرکردہ لیڈر اپنی برأت اور بے گناہی کے چاہے کتنے ہی ثبوت کیوں نہ پیش کریں مگر یہ بات ساری دنیا کو معلوم ہے اور آفتاب سے زیادہ روشن ہے کہ بابری مسجد کے انہدام کا سب سے بڑا ذمہ دار کون ہے، بدیہیات و

یقینیات کے لیے ثبوت کی کیا ضرورت؟ اور ثبوت رہ کر بھی کیا کرے گا جب کہ جس کے ہاتھ میں اقتدار ہو وہ جس ثبوت کو چاہے دباؤ ڈال کر اپنے موافق بنالے، اترپردیش کی سابق وزیراعلا اپنے منصب سے دست بردار ہونے کے بعد یہی تو فرمارہی ہیں مگر جس طرح گجرات میں بیسٹ بیکری کے مجرمین بری ہوگئے وہی صورت مسجد کے معاملے میں بھی نظر آرہی ہے، ستم ظریفی یہ ہے کہ بعض مسلم لیڈر بھی گھبرا کر صرف مثبت یا منفی تصفیہ ہی پر راضی ہوگئے ہیں، ہمارے نزدیک اگر مجرم کو قرار واقعی سزا نہ ملے تو وہ اور ڈھیٹ ہوجاتا ہے اور پھر آیندہ ظلم وجور کا انسداد نہیں ہوتا۔

اب یہ بات اور کھل کر سامنے آتی جارہی ہے کہ ارباب اقتدار کے نزدیک بابری مسجد کا انہدام نہ کوئی جرم تھا اور نہ قانون شکنی، اگر ہو بھی تو انہیں اس کی پروا نہیں، وہ اسے اپنے اثر ورسوخ سے ٹھیک کرلیں گے، اب مسئلہ صرف اس قدر ہے کہ اس کی جگہ پر مندر بن جائے، یہی بات وزیراعظم اور نایب وزیر اعظم دونوں فرمارہے ہیں، گزشتہ مہینے رام مندر تعمیر کے سب سے بڑے حامی پرم ہنس رام چندر داس کی چتا کے سامنے دونوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مہنت کو بہترین خراج عقیدت یہ ہوگا کہ ان کی خواہش کی تکمیل کے لیے اجودھیا میں رام مندر بنایا جائے، جو لوگ اس کی مخالفت کررہے ہیں انہیں عقل سلیم سے کام لے کر گھٹیا سیاست سے پرہیز کرکے رام مندر کی تعمیر کی راہ ہموار کرنی چاہیے، اب مہنت کے دیرینہ خواب کو شرمندہ تعبیر ہونے سے روکا نہیں جاسکتا، نایب وزیراعظم نے وزیراعظم کی تقریر کا ابہام یہ کہہ کر دور کردیا کہ مندر متنازع زمین ہی پر تعمیر ہوگا، لوک سبھا میں وزیراعظم پر اعتراض ہوا تو حسب معمول انہوں نے میڈیا کو مورد الزام ٹھہرایا، اس پر کانگریس کے چیف وہپ پریہ رنجن داس منشی نے کہا وزیراعظم کو بیانات بدلنے کی عادت ہے اور کانگریس کے ترجمان جے پال ریڈی نے کہا واجپئی اجودھیا تنازع پر ۲۰ ایسے متنازع بیانات دے چکے ہیں جن کے بعد انہیں وضاحت کرنا پڑی ہے، خیر ہم تو یہ کہنا چاہتے ہیں کہ نہ بابری مسجد کے انہدام کا شنیع جرم ان کے سامنے کوئی مسئلہ ہے، نہ مسجد کی تعمیر سے ان کو بحث ہے انہیں صرف متنازع جگہ پر رام مندر کی تعمیر کی فکر ہے جس کے لیے وہ جا وبے جا بیانات دینے کے عادی ہوگئے ہیں، رہے مذاکرات تو وہ سادہ لوحوں کو جھانسا دینے کی ایک کوشش ہے۔

چند ماہ پہلے ہم نے بڑے افسوس کے ساتھ اطلاع دی تھی کہ مشہور انگریزی رسالہ مسلم انڈیا مالی زیرباری کی وجہ سے بند ہورہا ہے، یہ رسالہ مشہور قومی وملی رہنما اور بے باک لیڈر جناب سید شہاب الدین سابق ایم پی کی ادارت میں بیس سال سے مفید ملی خدمات انجام دے رہا تھا جس کے سنجیدہ مضامین غیرمسلم اہل وطن اور انگریزی داں طبقے کو مسلمانوں کے مسایل وحالات سے صحیح واقفیت بہم پہنچانے کے

علاوہ ان کے بارے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کر رہے تھے اب یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ سید صاحب نے گوناگوں دشواریوں کی وجہ سے مسلم انڈیا پندرہ روزہ ملی گزٹ کے اڈیٹر ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں کے حوالے کر دیا ہے جو مشہور دانش ور اور مشرق وسطی اور عرب امور کے ماہر اور چالیس برس سے علم و تحقیق اور صحافت کے میدان میں سرگرم عمل ہیں، ان کی ادارت میں سات ماہ کے وقفے کے بعد مسلم انڈیا کا نیا شمارہ نکلا ہے جو ۱۲۸ صفحے پر مشتمل ایک خصوصی نمبر ہے، اس میں نومبر ۲۰۰۲ء سے مئی ۲۰۰۳ء تک کے واقعات و مسائل کو جمع کیا گیا ہے، اس کی وجہ سے اس کی حیثیت قیمتی دستاویز کی ہوگئی ہے، اس پر مفصل تبصرہ آیندہ کسی شمارے میں چھپے گا، رسالے کی خریداری اور مزید معلومات کے لیے اس پتے پر خط و کتابت کی جائے: ڈی ۸۴-ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025۔

یہ سطریں زیر تحریر تھیں کہ ممبئی میں ہوش و حواس اڑا دینے والے بم دھماکوں کی خبر ملی، ابتدائی رپورٹوں کے مطابق اس میں تقریباً ۵۰ آدمی ہلاک اور ۱۵۰ سے زیادہ زخمی ہوئے جن میں سے اکثر کی حالت تشویش ناک ہے، ۱۹۹۳ء کے بعد کا یہ دوسرا بڑا دھماکہ ہے جس کی شدت اور سنگینی کی خبر پڑھ کر ہم لرز اٹھے، آخر یہ انسانوں کے بھیس میں کہاں سے وحشی اور درندے آگئے تھے جو ایسا غیر مہذب، غیر شریفانہ، غیر انسانی اور شیطانی کام کر بیٹھے اور ان کی انسانی حس اور رحم و مروت کا جذبہ بیدار نہیں ہوا، ہم اس کی شدید مذمت کرتے ہیں، ایسے بے رحم اور بدطینت لوگوں کو قرار واقعی سزا ملنی چاہیے، عموماً اس طرح کے واقعات میں شک کی انگلی مسلمانوں کی طرف اٹھتی ہے مگر ایسے درندہ صفت لوگوں کے نام خواہ مسلمانوں ہی جیسے ہوں، اسلام جیسے دین رحمت سے ان کا کیا تعلق، وہ تو کیا دنیا کا کوئی مذہب بھی دہشت گردی کو پسند نہیں کرتا، حکومت کی ذمہ داری ہے حقیقی مجرموں کو عبرت ناک سزا دے لیکن ان کی حرکت کی وجہ سے بے گناہ لوگوں کو پریشان کرنے یا چند افراد کے ناروا فعل کی سزا ان کے ہم مذہبوں کو نہیں دینا چاہیے، گجرات کی طرح اس کو رد عمل کا بہانہ بھی نہیں بنانا چاہیے، حکومت کو اصل مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے علاوہ اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ اس طرح کے سنگین واقعات کیوں پیش آتے ہیں، اگر یہ وحشیانہ حرکت کسی خاص بے چینی کا نتیجہ تو اس کا تدارک کیا جانا چاہیے، ریاستی حکومت کی طرح مرکزی حکومت بھی اس سے بری الذمہ نہیں ہوسکتی، دہشت گردی کے خلاف اس کے جنگ کے تمام دعووں اور اعلانات کے باوجود دہشت گرد پارلیمنٹ میں جا گھستے ہیں، بی جے پی کے دور میں تشدد اور دہشت گردی کے واقعات میں برابر اضافہ ہو رہا ہے جو اس کے لیے قابل غور ہے۔

مقالات

فریدالدین مسعود گنج شکر کا دور، تعلیمات اور شخصیت

از جناب فیروزالدین احمد فریدی صاحب☆

کسی عظیم شخصیت سے آگہی حاصل کرنے کے لیے ہمیں اس دور کا شعور ہونا چاہیے جس میں اس شخص نے اپنی عمر گزاری ہو، فریدالدین مسعود گنج شکر ۱۱۸۰ء اور ۱۲۷۱ء کے درمیان تقریباً نوے برس اس دنیا میں رہے، نوے برس کا یہ دور تاریخ میں قرون وسطی یعنی Middle Ages کے نام سے جانا جاتا ہے، یہ ایک عجیب و غریب دور تھا، ایک طرف مسلمانوں کی دنیاوی حکومت ان پستیوں میں گر گئی تھی جن کی مثال تاریخ میں کم ہی ملے گی، دوسری طرف اسلام کی روحانی سلطنت نے عروج کی ان بلندیوں کو چھوا جن کی مثال تاریخ میں کم ہی ملے گی، یہ وہ دور ابتلا تھا جب بغداد میں صدیوں سے قایم خلافت عباسیہ اور قرطبہ میں صدیوں سے قایم خلافت امویہ کا نام و نشان مٹ گیا تھا، یہی وہ دور تھا جب چنگیز خاں ۱۱۶۲ء میں یا اس کے لگ بھگ منگولیا میں پیدا ہوا، بابا صاحب اس کے ۱۸ برس بعد ملتان کے مضافات میں ایک قصبے "کوٹھے وال" یا "کھتوال" میں پیدا ہوئے جو ملتان سے دس میل شمال میں آج بھی موجود ہے، جب چنگیز خاں ۱۲۲۷ء میں مرا تو بابا صاحب ۴۶، ۴۷ سال کے تھے، یہی وہ دور تھا جب سلطان صلاح الدین ایوبی نے ۱۱۹۳ء میں وفات پائی، بابا صاحب اس وقت بارہ تیرہ برس کے لڑکے تھے، یہی وہ دور تھا جب ۱۵/جون ۱۲۱۵ء کو شاہ انگلستان جان (Jhon) نے میگنا کارٹا (Magna Carta) پر دستخط کیے، جب انگلستان میں رنی میڈ کے مقام پر اس دستاویز پر دستخط ہو رہے تھے تو بابا صاحب ۳۴، ۳۵ برس کے جوان تھے، اس وقت روم میں مشہور پوپ انوسنٹ سویم (Innocent-III)

☆ کھتوال ہاؤس، ۵۴-اے، گلی نمبر ۱۵، باتھ آئی لینڈ، کراچی، ۷۵۵۳۰۔

پاپائے روم تھا، کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگی کہ شاہِ انگلستان جان کی اپیل پر اس مشہور پوپ نے میگنا کارٹا کو منسوخ قرار دیا تھا، ۱۲۳۶ء میں جب اسپین میں مسلم حکومت کے دارالسلطنت قرطبہ سے مسلمانوں کی حکومت ہمیشہ کے لیے ختم ہوئی، اس وقت بابا صاحب تقریباً ۵۵ برس کے تھے اور ۲۲ برس بعد جنوری ۱۲۵۸ء میں جب ہلاکو نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی تو بابا صاحب اسی برس کے پیٹے میں تھے۔

بغداد اور قرطبہ مشرق و مغرب میں نہ صرف مسلم حکومتوں کے دارالخلافے اور مسلم تہذیب و تمدن بلکہ بین الاقوامی علوم و فنون کے مراکز تھے، تاریخ کی ستم ظریفی دیکھیے کہ ایک طرف مشرق اور مغرب میں عقل اور علم کے یہ قدیم مراکز اجڑ رہے تھے اور دوسری طرف اسی دور میں ۱۲۴۹ء میں مغرب میں آکسفورڈ کے مقام پر انگلستان کا پہلا کالج "یونیورسٹی کالج آکسفورڈ" کے نام سے قایم ہو رہا تھا اور ادھر مشرق میں بابا صاحب تقریباً ستر برس کی عمر میں پاک پتن میں جو اس وقت اجودھن کہلاتا تھا، عقل، علم اور عشق کے اس بین الاقوامی مرکز کی بنیاد رکھ رہے تھے جو بابا صاحب کا جماعت خانہ کہلاتا تھا، یہی وہ دور تھا جب ۱۱۸۷ء میں سلطان صلاح الدین نے یروشلم فتح کیا جو اس کے بعد تقریباً آٹھ صدی تک یعنی ۱۹۶۷ء تک مسلمانوں کے پاس رہا، یہی وہ دور تھا جس میں ۱۱۸۹ء میں تیسری صلیبی جنگ کا آغاز ہوا جس میں انگلستان کا بادشاہ رچرڈ شیر دل شریک تھا اور سب سے آخر میں یہ بات کہ یہی وہ دور تھا جب سلطان شہاب الدین محمد غوری نے ۱۱۹۳ء میں نرائن کے مقام پر اجمیر اور دلی کے راجہ پرتھوی راج کو شکست دے کر دلی پر قبضہ کرلیا، ۱۱۹۳ء ہی وہ سال تھا جب صلاح الدین ایوبی کا وصال ہوا، اس وقت بابا صاحب بارہ، تیرہ برس کے لڑکے تھے، ۱۲۰۶ء میں محمد غوری کے نامی گرامی غلام اور جنرل قطب الدین ایبک نے سلطنتِ دہلی کی بنیاد رکھی، ایبک کے بعد مشہور سلاطینِ دہلی میں التمش، رضیہ سلطانہ، ناصر الدین محمود اور غیاث الدین بلبن کے نام آتے ہیں، بلبن ۱۲۶۶ء میں سلطانِ دہلی بنا اور بابا صاحب نے بلبن کے ابتدائی دورِ سلطانی میں غالباً ۱۳ر اگست ۱۲۷۱ء کو نوے برس کی عمر میں وفات پائی، اس عہد کا مشہور مورخ ضیاءالدین برنی تاریخ کی اپنی مشہور کتاب "تاریخ فیروز شاہی" میں لکھتا ہے:۔

"یہ عہد ایسے مشایخ کی موجودگی سے مزین اور مشرف تھا کہ ان جیسی ہستی مدت

میں پیدا ہوتی ہے، مثلاً اس (یعنی بلبن) کے عہد کے ابتدائی دور میں شیخ شیوخ العالم فریدالدین مسعود بہ قیدِ حیات تھے، وہ قطب عالم اور مدارِ جہاں تھے، اس خطۂ زمین کے لوگوں کو انہوں نے اپنی پناہ اور اپنے سائے میں لے لیا تھا...... ان کے قرب اور برکتِ انفاس کی وجہ سے لوگ دین و دنیا کی مصیبتوں سے نجات پاتے تھے اور جو اس کے اہل تھے، وہ ان کی ارادت کے ذریعے بلند مراتب حاصل کرتے تھے"۔

ضیاء الدین برنی کے یہ دل نشین اور مشہور فقرے پڑھ کر ہماری نظر بے ساختہ زمین سے اٹھ کر تصوف کے آسمان پر پڑتی ہے، تاریخ گواہ ہے کہ آسمانِ تصوف پر اتنے چمکتے دمکتے ستارے نہ کبھی پہلے ایک ساتھ اس آب و تاب سے جگمگاتے نظر آئے اور نہ بعد میں، یوں سمجھ لیجیے کہ جیسے بعض زمینیں زرخیز ہوتی ہیں، ویسے ہی بعض زمانے بھی مردم خیز ہوتے ہیں، یہ دور ایک انتہائی مردم خیز دور تھا، بابا صاحب کے تیرہ مشہور ہم عصر صوفیہ کے نام یہ ہیں:۔

۱۔محی الدین ابن عربی   ۲۔جلال الدین رومی   ۳۔شیخ سعدی

۴۔شہاب الدین سہروردی   ۵۔لال شاہ باز قلندر (سہون)   ۶۔بہاءالدین زکریا (ملتان)

۷۔جلال الدین بخاری (اوچ)   ۸۔معین الدین چشتی   ۹۔قطب الدین بختیار کاکی

۱۰۔نظام الدین اولیا   ۱۱۔علاءالدین صابر (کلیر)   ۱۲۔فریدالدین عطار

۱۳۔ابوالحسن علی الشاذلی۔

اس دور کے چودھویں عظیم بلکہ عظیم ترین صوفی عبدالقادر جیلانی کا نام بزمِ صوفیہ کی اس فہرست میں صرف اس لیے شامل نہیں کیا گیا کیوں کہ ان کا وصال بابا صاحب کی ولادت سے تیرہ چودہ برس پہلے ہوگیا تھا، غور کیجیے کہ اسلامی تصوف کے عظیم سلسلوں سے دو یعنی "قادریہ" اور "شاذلیہ" سلسلوں کے بانی شیخ عبدالقادر جیلانی اور شیخ ابوالحسن علی الشاذلی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں، دو عظیم سلسلوں یعنی چشتیہ اور سہروردیہ کے مشہور ترین صوفیہ یعنی خواجہ معین الدین چشتی اور خواجہ شہاب الدین سہروردی بھی اسی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں، برصغیر پاک و ہند سے باہر ابن عربی، جلال الدین رومی، شیخ سعدی اور فریدالدین عطار جیسے شہرۂ آفاق نام اور برصغیر میں سہون کے لال شاہ باز قلندر، ملتان کے بہاءالدین زکریا، اوچ کے جلال الدین بخاری اور چشتیہ

سلسلے کے قطب الدین بختیار، نظام الدین اولیا اور کلیر کے علاء الدین صابر سب اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں، ایسا دور پہلے آیا، نہ بعد میں، دنیا کے بادشاہوں کی بربادی کا یہ دور دین کے شہنشاہوں کی تاج داری اور دنیاوی سلطنتوں کی تباہی کا یہ زمانہ دینی خانقاہوں کے قیام کا دور تھا۔

ایک عظیم صوفی یا پیغام بر کا پیغام اس کی شخصیت کا مظہر ہوتا ہے یا دوسرے الفاظ میں اس کی شخصیت اس کے پیغام میں مضمر ہوتی ہے، شخصیت سے صحیح معنوں میں شناسائی ہوگئی تو سمجھ لیجیے کہ پیغام تک رسائی ہوگئی، پیغام دل میں اتر گیا تو جان جایئے کہ شخصیت کے حضور میں حاضری ہوگئی اور نصیب یاور ہے تو حاضری سے حضوری قلب بھی مل گئی، ۱۹۹۸ء میں مجھے زندگی میں پہلی بار ضلع شیخو پورہ کے قصبے ننکانہ صاحب جانے کا موقع ملا، یہ قصبہ گرونانک کی جائے پیدائش ہے اور سکھوں کو اس جگہ سے وہی عقیدت ہے جو مسلمانوں کو مکے مدینے سے ہے، یہاں سکھوں کا ایک مقدس ترین قدیم گردوارہ ہے، جب میں اس گردوارے کی مختلف غلام گردشوں اور چھوٹے بڑے کمروں میں گردش کرتا گردوارے کے عین وسط میں پہنچا تو میں نے خالص چاندی کے ستونوں پر کھڑی ہوئی ایک خوبصورت چھتری دیکھی جس کے نیچے چاندی کے ورقوں میں لپٹی ہوئی ایک عظیم الجثہ کتاب بہت اہتمام سے رکھی تھی جو گرمکھی رسم الخط میں تھی، یہ سکھوں کی مقدس مذہبی کتاب ''گرنتھ صاحب'' تھی اور چاندی جیسی سفید ڈاڑھی والا ایک سکھ اسے بہت عقیدت سے گونجتی ہوئی آواز میں پڑھ رہا تھا، جو کچھ وہ پڑھ رہا تھا، وہ بابا صاحب سے منسوب، بابا صاحب کا کلام تھا جسے سنسکرت میں ''شلوک''، ہندی میں ''اشلوک'' اور اردو میں ''شعر'' کہہ سکتے ہیں، یہ اشلوک قدیم ملتانی یا سرائیکی زبان میں تھا اور گرنتھ صاحب میں اس کا نمبر ''۱۹'' ہے، اشلوک کے الفاظ یہ ہیں:۔

جنگل جنگل کیا بھویں؟ وَن کنڈا موڑیں   وسی رب ہیالیے، جنگل کیا ڈھونڈیں

اللہ کو پانے کا یہی وہ رستہ ہے جو مختلف زمینوں، زمانوں اور زبانوں میں اللہ جانے کب سے بتایا جاتا رہا ہے، گرونانک نے بابا صاحب سے منسوب اس مشہور اشلوک کو گرنتھ صاحب میں شامل کرکے، اس شعر کو سکھ مذہب میں وہی مقام دے دیا جو مسلمان قرآنی آیات کو دیتے ہیں۔

گرنتھ صاحب میں بابا صاحب سے منسوب کل ۱۱۲ اشلوک ہیں جو گرنتھ صاحب کے ایک علیحدہ باب میں درج ہیں، جس کا خصوصی عنوان ہے ''شلوک فرید جی کے''، بابا صاحب سے منسوب ایک اور اشلوک جو گرنتھ صاحب کا اشلوک نمبر ۲۸ ہے، یہ ہے:۔

روٹی میری کاٹھ کی، لاون میری بھکھ   جنھاں کھادی چوپڑی، گھنے سہن گے دُکھ

اس کا منظوم اردو ترجمہ یہ ہوسکتا ہے:۔

روٹی میری کاٹھ کی اور سالن میرا بھوک   جو چکنی چپڑی کھاتا ہے، وہ دکھ بھی بہت اٹھاتا ہے۔

اسی مفہوم کا بابا صاحب کا ایک اور اشلوک، گرنتھ صاحب کا اشلوک نمبر ۲۹ ہے، جس کے الفاظ اتنے عام فہم ہیں کہ آج کا انسان حیران ہوجاتا ہے کہ کیا سولہویں صدی عیسوی کی گرنتھ صاحب میں شامل یہ اشلوک واقعی اتنی صدیوں پرانا ہوسکتا ہے؟ اشلوک یہ ہے:۔

رُکھی سُکھی کھاءِ کے ٹھنڈا پانی پی ءِ   دیکھ پرائی چوپڑی نہ ترسائیں جی

اس کا منظوم اردو ترجمہ یہ ہوسکتا ہے:۔

روکھی سوکھی کھا کے ٹھنڈا پانی پی ،   پرائی چپڑی دیکھ کے نہ کر میرا جی

ان اشلوکوں کی عملی تفسیر بابا صاحب خود تھے، انہیں اپنے خالق سے عشق، اس کی مخلوق سے پیار اور دنیاوی دولت سے نفرت تھی، زندگی بھر طرح طرح کے تحائف پیش ہوتے رہے لیکن انہیں رات تک رکھنے کی اجازت نہ تھی کیوں کہ یہ اللہ پر توکل کے اس معیار کے خلاف تھا جو آکسفورڈ یونیورسٹی کی ہم عصر اجودھن کی اس یونیورسٹی کے تعلیمی نصاب کا سب سے پہلا اور سب سے اہم سبق تھا۔

اور اجودھن کی یہ یونیورسٹی تھی کیا؟ گارے اور کچی اینٹوں سے بنا ہوا ایک بڑا سا کمرہ جس کی بنیادیں کعبہ مشرفہ کی طرح انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں رکھی گئیں، اس لمبے سے کچے کمرے میں نہ صرف برصغیر پاک وہند بلکہ دوسرے ممالک کے صوفیہ، علما اور بزرگان باصفا روکھی سوکھی کھاتے، ٹھنڈا پانی پیتے اور اپنے من میں بسے ہوئے اپنے رب کو تلاش کرتے، تن پر موٹے جھوٹے کپڑے، سر منڈے ہوئے، کچی زمین پر ساتھ ساتھ بستر، ہاتھوں میں کتابیں، دماغ میں رب کا تصور، دل میں رب کی یاد، زبان پر رب کا نام اور منہ میں روزہ، راتیں ذکر وفکر میں کٹتیں، سورج

چڑھتا تو سب اپنے کام دھندے سے لگ جاتے، کوئی پانی بھر کر لاتا، کوئی جنگل سے لکڑیاں کاٹ
کر لاتا، کوئی برتن دھوتا، کوئی جنگلی پھول پھل اور پتے توڑ کر لاتا، کوئی انہیں پانی میں ابال کر کبھی
نمکین اور کبھی بلا نمک کا سالن پکاتا، گندم کا آٹا مل جاتا تو اس کی روٹیاں پک جاتیں، نہ ملتا تو جوار
کی موٹی موٹی روٹیوں پر ہی گزارا ہو جاتا، دسترخوان ہوتا تو اسے زمین پر بچھا کر کھانا اس پر چن
دیا جاتا، نہ ہوتا تو ان اللہ والوں کے لیے اللہ کی زمین ہی دسترخوان کا کام دیتی، ہر ایک زمین پر
زانو سے زانو ملا کر بیٹھتا، ہر ایک کو برابر کا کھانا ملتا، تخصیص کھانے میں ہوتی، نہ کھلانے میں ہوتی،
نہ بٹھانے میں ہوتی۔

سچ تو یہ ہے کہ تیرہویں صدی عیسوی میں، اس پورے برصغیر میں اگر زمین کا کوئی ٹکڑا
ایسا تھا جہاں شاہ و گدا سب کا ایک جیسا استقبال اور سب سے ایک سا سلوک ہوتا تھا، تو وہ
پنجاب کے اس دور افتادہ، ریتیلے اور گرم قصبے کے جماعت خانے اور اس کے ارد گرد کی یہ چند سو
مربع گز زمین تھی، یہ ایک اقامتی یونیورسٹی تھی جہاں نہ صرف تعلیم بلکہ تربیت، تجربہ، خوراک اور
رہائش سب مفت تھی، اس یونیورسٹی کی تعلیم کا نصاب عقل، علم اور عشق تھے، یہاں کی تعلیم کا
مقصد کسی ڈگری کا حصول نہ تھا، نہ کسی ملازمت کا، اس تعلیم کا واحد مقصد درویشی کی اس شمع کے
نور اور اس کی حرارت کو زیادہ سے زیادہ جذب کرنا تھا، جس کے دم سے درویشی کے اس سلسلے کا
ابد تک قایم رہنا ازل سے مقدر ٹھہر چکا تھا۔

فریدالدین مسعود گنج شکر اپنی مدھم، ملایم، میٹھی، موہنی اور مدھ بھری آواز میں، ٹھہر ٹھہر
کر، بعض اوقات دہرا دہرا کر قرآن، حدیث، تصوف اور اسلامی قوانین کے انتہائی پیچیدہ
مسایل یوں سمجھاتے کہ یہ ابدال اور نابغۂ روزگار علما اور فضلا جو یہاں طالب علم کی حیثیت سے
مقیم تھے، عش عش کر اٹھتے، ان کا کہا اللہ کا کہا ہوتا تھا، گو وہ اللہ کے بندے کی زبان سے ادا ہو رہا
ہوتا تھا اور پھر تعلیم خالی زبان سے تو نہ تھی، سب سے بڑا معلم تو شیخ الجامعہ یعنی یونیورسٹی کے
چانسلر کا اپنا کردار تھا، شفاف آئینے کی طرح ایک ایسا کردار جس میں عمر بھر ظاہر اور باطن میں
ذرہ بھر فرق نہیں رہا، کھرے سونے کی طرح ٹھوس، پایدار اور اندر باہر سے یکساں چمکیلا......
اور سب سے آخر میں اس تعلیم کا ذریعہ وہ باطنی توجہ تھی جو شیخ الجامعہ اپنے طالب علموں پر کرتے

رہتے، نظر نہ آنے والی برقی شعاعیں شیخ کی آنکھوں سے اور محسوس نہ ہونے والی مقناطیسی لہریں
شیخ کے دل اور دماغ سے نکلتیں اور تیر کی طرح مریدانِ با صفا کے قلب و نظر میں پیوست
ہو جاتیں اور پھر وہ سرمدی سفر شروع ہو جاتا جہاں انسان تزکیۂ نفوس، تصفیۂ قلب، تجلیۂ روح
اور تخلیۂ روح و قلب کی ارفع منازل طے کرتا، فنا سے بقا، مکاں سے لامکاں، بے خودی سے
خودی اور خودی سے بے خودی کی اس ناقابل بیان لذت سے سرشار ہوتا ہے، جہاں وہ خود کو
پہچان کر سیدھا خدا تک پہنچ جاتا ہے۔

خدا نے انہیں وہ چشم بینا عطا کی تھی کہ چہرے پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہی دل کی تہ
تک پہنچ جائے اور بعض اوقات یہ کام نظر ڈالے بغیر بھی ہو جاتا، ان کی صحبت میں آدمی انسان
بن جاتا جس کا بننا فرشتے سے بہتر مگر اس سے کہیں زیادہ مشکل ہوتا ہے، دہلی کے اعلیٰ ترین
درس گاہوں کے سند یافتہ یہ علما اور فضلا جب اجودھن کے جماعت خانے کے کچے فرش پر بیٹھ کر،
جس کی بھر بھری مٹی کی سوندھی مہک، شیخ کی گفتگو کی بھینی خوشبو سے مل کر فضا کو ہر لمحے معطر کیے
رہتی، گنج شکر کی شکر بار زبان سے بڑے بڑے مسایل کا حل، چھوٹے چھوٹے سیدھے سادے
جملوں میں سنتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ دریا کو کوزے میں بند کرنا کسے کہتے ہیں۔

آپ کا قول ہے کہ تدبیر میں نقصان اور تسلیم میں سلامتی ہے، قول مختصر لیکن اس کی
گہرائی قابلِ غور ہے، جتنا غور کریں گے اتنی ہی گہرائی پاتے جائیں گے، آپ کا فرمان ہے کہ
جو چڑیوں کو دانہ ڈالتا ہے ایک دن ہما بھی اس کے دام میں پھنس جاتا ہے، کچھ لوگوں کو یہ صرف
ایک خوبصورت فقرہ نظر آئے گا، کچھ کو اس سادے سے فقرے میں شاید بہت کچھ نظر آ جائے گا،
ایک مرتبہ کسی نے چھری پیش کی تو فرمایا، مجھے چھری نہ دو، مجھے سوئی دو کہ میں کاٹتا نہیں، سیتا
ہوں، یہ ایک فقرہ نہیں بلکہ ان کی عظیم شخصیت کا ایک فوٹو ہے، یہ ایک دریا ہے جو ایک کوزے
میں بند ہے، ایک مرتبہ فرمایا کہ سات سو بزرگانِ دین سے چار سوال کیے گئے، سب نے ایک سا
جواب دیا، سوالات اور جوابات یہ تھے:

سوال	جواب
۱۔ سب سے عقل مند کون ہے؟	جو دنیا چھوڑ دے۔

۲۔ سب سے مال دار کون ہے؟　جو قانع ہو۔

۳۔ سب سے مفلس کون ہے؟　جو قانع نہیں ہے۔

۴۔ سب سے ولی صفت کون ہے؟　جو کسی سے متغیر نہ ہو۔

جب ان سوالات کا مجسم جواب سننے والوں کی نظروں کے عین سامنے بیٹھا ہوا اور اپنی میٹھی اور مدھم آواز میں، ٹھہر ٹھہر کر، یہ جوابات بتا رہا ہو تو بھلا کون سا انسان ہے جس کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں ایک ایک جواب نقشِ دوام کی طرح ثبت نہ ہو جائے۔

جیسے انسان کا رب ہر گھڑی اپنے بندے یا بندی کے ساتھ ہوتا ہے، ویسے ہی جو اپنے رب کا دوست ہوتا یا ہوتی ہے، وہ ہر گھڑی اور ہر صدی میں انسان کا دوست ہوتا یا ہوتی ہے، جس میں قوم، نسل، عقیدے، زبان، جنس، رنگ، عمر اور ذات پاک کی قید نہیں ہوا کرتی، یہ قدرتی بات ہے کہ ہر انسان اپنے دوست کے بارے میں جاننا چاہتا ہے، اس انسان دوست درویش کی ذات والا صفات کا ایک عام دن یعنی (Typical Day) کیسے گزرتا تھا، اس کی ایک جھلک اس تحریر کا آخری اور خوش گوار حصہ ہے۔

بابا صاحب کم بولتے، بہت کم اور بہت سادہ کھاتے اور بہت ہی کم سوتے تھے، رات جب سارا سنسار سو رہا ہوتا، وہ جاگ رہے ہوتے، اجودھن کی تاریک رات کے مکمل سناٹے میں، وہ کبھی بے قراری کے عالم میں، اپنے ہاتھ پیچھے باندھے، اپنے اس چھوٹے سے کچے حجرے میں چہل قدمی کرنے لگتے جہاں وہ آج بھی آرام کر رہے ہیں، وہ اپنی مدھم، میٹھی، ملایم، مدبھری اور من موہنی آواز میں، چپکے چپکے سرگوشیوں میں اپنے محبوب سے کہتے:۔

"میرے محبوب میری بس ایک ہی آرزو رہ گئی ہے کہ جب تک جیوں صرف تیری یاد میں جیوں اور جب مروں تو تیرے قدموں میں گر کر تجھے دیکھنے کے لیے زندہ ہو جاؤں، مجھے بتا تو سہی کہ دونوں جہان میں تیرے سوا میرا بھلا اور کون ہے؟ میں جیتا ہوں تو صرف تیرے لیے، مرتا ہوں تو صرف تیرے لیے"۔

رات جیسے جیسے تاریک، ساکت اور ساکن ہوتی جاتی ان کی بے چینی بڑھتی جاتی، وجد کا عالم طاری ہو جاتا، حجرے میں رقص کرنے لگتے، رات اور ساکت اور ساکن ہو جاتی جب

رب المشرقین والمغربین اپنے کسی بندے یا بندی پر اپنے فضل کی بوچھاڑ کرتا ہے تو یہی ہوا کرتا ہے، یہ وجد ایک فرد پر طاری ہوتا تھا نہ یہ رقص ایک فرد کا ہوتا تھا، یہ وجد ایک عالم پر اور یہ رقص رقصِ کائنات ہوتا تھا، جس میں ساری دوئیاں ختم اور سب دوریاں دور ہو جاتی تھیں۔

رات ختم ہوتی، سحری کا وقت آتا، فریدالدین مسعود کی سحری کیا ہوتی تھی؟ صرف اور صرف روزے کی نیت، فجر کی اذان بلند ہوتی تو نیچی چھت والے اس چھوٹے سے کچے حجرے کا لکڑی کا دروازہ آہستہ سے کھلتا، تاروں کی چھاؤں اور سحر کی ٹھنڈی ہواؤں میں وہ باہر آتے، ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم، نکلتا ہوا قد، صحت مند جسم، گندمی رنگ، اونچا ماتھا، بڑی بڑی روشن آنکھیں، چوڑے کندھے، فراخ سینہ، شب بھر کے رت جگے کے باوجود تر و تازہ گلاب کے مانند کھلا ہوا شاداب اور بھرا بھرا چہرہ جس سے نور بھی چھلکتا تھا اور جس سے دبدبہ بھی ٹپکتا تھا، جسے دیکھ کر کشش بھی محسوس ہوتی تھی اور رعب بھی طاری ہوتا تھا، جمال اور جلال کا حسین امتزاج، چاندی اور چاندنی کی طرف سفید براق داڑھی جو رخساروں پر چھدری اور ٹھوڑی پر گھنی تھی، ایک کرشماتی شخصیت جسے ایک بار دیکھ کر دوسری بار، دوسری بار دیکھ کر تیسری بار اور پھر بار بار دیکھنے کو جی چاہتا تھا اور کبھی جی نہ بھرتا تھا، اپنی شکر جیسی میٹھی آواز میں گنج شکر اللہ کی مخلوق کو دعائیں دیتے، ان پر سلامتی بھیجتے، حضور ﷺ کے حضور چپکے چپکے سلام پیش کرتے، اپنے اکلوتے محبوب کے نشے میں چور، اس کی دھن میں گم، اس کی لو سے لو لگائے، وقار سے آہستہ آہستہ نپے تلے قدم اٹھاتے، فجر کی نماز کی امامت کے لیے مسجد کی طرف روانہ ہو جاتے، سینکڑوں مشتاق نظریں ان کی سر سے پاؤں تک بلائیں لیتیں، سینکڑوں باادب ہاتھ ایک ساتھ سلام کے لیے اٹھتے، کتنی آنکھیں تھیں جو بھیگ جاتیں اور وقت تھم جاتا کہ امامت کے لیے امامِ وقت خود آ رہا ہے۔

نماز کی دو رکعتیں کیا پڑھاتے دلوں کی دنیا ہی بدل ڈالتے، لگتا تھا کہ وہ اپنے رب سے اور ان کا رب ان سے باتیں کر رہا ہے، اسی وجہ سے انہیں نماز پڑھتے دیکھ کر دیکھنے اور پڑھنے والوں پر دیر تک عجیب سا اثر طاری رہتا، ان کی نماز جنت کی خواہش میں ہوتی، نہ جہنم کے ڈر سے، وہ تو صرف اس ایک ذات کے لیے ہوتی جو ان کی نس نس میں سمایا ہوا تھا، اس نماز

میں ان کا جسم ہی نہیں، ان کا خیال بھی اس ذات کے حضور سجدہ ریز ہوتا تھا جوان کی زندگی کا مرکز اور محور تھی، نماز ختم ہوتی تو وہ آہستہ سے اپنے پھٹے پرانے مصلّے سے اٹھتے اور نپے تلے قدم اٹھاتے، اپنے محبّ اور محبوب کی دھن میں گم، اس کی مخلوق کی توجہ کا مرکز بنے، ان کی امیدوں کا سہارا، ان کے غموں کا مداوا اور ان کے درد کا مسیحا بنے اپنے اسی حجرے میں پہنچ جاتے جہاں وہ آج بھی آرام کر رہے ہیں، یہ آرام گاہ ایک مزار یا مقبرہ نہیں بلکہ مرکز عشق ہے، جہاں آتے تو سب ہی ہیں لیکن جہاں انتظار عاشقوں کا رہتا ہے۔

کچے حجرے میں جاتے ہی لکڑی کا دروازہ اندر سے بند کر دیا جاتا اور اگلی دو گھڑی انسان تو انسان کسی فرشتے کو بھی اندر جانے کی اجازت نہ تھی، یہ وقت اس ایک ذات کے آگے اس ایک سجدے کے لیے وقف تھا جب مسعود اور اس کے معبود کے درمیان کسی غیر خیال کو غلطی سے گذرنے کی بھی اجازت نہ تھی، یہی وہ ایک سجدہ ہے جو قدسی مقال اقبال کے لافانی اور لاثانی الفاظ میں آدمی کو ہزاروں سجدے سے آزاد کرتا ہے، جس میں اللہ کے آخری رسول ﷺ اپنے دوست کے آگے رو رو کر کہا کرتے تھے: ''تیرے آگے میرا تمام جسم اور خیال بھی سجدہ کرتا ہے''۔

ظہر کی نماز کے بعد حجرے کا دروازہ کھول دیا جاتا، اللہ سے باتیں بہت ہوگئیں، اب وقت اللہ کے بندوں کے کام کرنے کا تھا، لوگ ایک ایک کر کے باری باری اندر آتے جاتے اور اپنی مشکلات اور مسایل بتاتے جاتے، کسی کو اپنی جوان بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرنے کا غم کھائے جا رہا تھا، کوئی کسی سرکاری افسر کے جبر کا شکار تھا، کسی کو سرکار دربار تک رسائی درکار تھی، کسی کا کوئی بھائی قریب المرگ تھا۔

آپ پوری توجہ اور ہمدردی سے ہر ایک کی پوری بات سنتے اور جب تک بات ختم نہ کر لیتا، روکتے نہ ٹوکتے، ہر ایک کی بپتا ایسے سنتے جیسے یہ اس پر نہیں ان پر بیت رہی ہو، ہر ایک کی دل جوئی کرتے، ہر ایک کی فوری اور پوری مدد کرتے، ان جیسا پیار بہتوں کو اپنوں میں بھی نہ ملتا تھا۔

بابا صاحب کے پاس جو بھی آتا کچھ لے کر جاتا اور جو بھی آتا کچھ لے کر آتا، جو شام

ڈھلے تک اجودھن کے غربا اور مستحقین میں تقسیم ہو جاتا، کوئی خالی ہاتھ آتا تو حکم تھا کہ آنے والا خالی ہاتھ آتو گیا ہے خالی ہاتھ واپس نہ جائے، سخی کے دربار کی یہ ریت اور شاہانہ روایت آج بھی یہ دستور قایم ہے، دربار سے خالی ہاتھ واپس آنے کی اجازت تب تھی نہ اب ہے۔

کبھی کسی حاجت مند سے اپنے مخصوص میٹھے لہجے میں آہستہ سے کہتے: ''جاؤ شکرانہ لے آؤ'' یہ اشارہ ہوتا کہ دعا قبول ہوگئی، اگر کبھی سائلوں کی بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے، ہر سائل سے فرداً فرداً ملنا محال نظر آتا تو حجرے سے باہر آجاتے اور بلند آواز میں کہتے: ''لوگو! سنو! میرے پاس ایک ایک کر کے تسلی سے آؤ تا کہ میں ہر سائل کے مسائل پر الگ الگ اور پوری توجہ دے سکوں''، اکثر کہا کرتے کہ جب تک میرے حجرے کے باہر ایک سایل بھی بیٹھا ہو، مجھے عبادت میں لطف نہیں آتا۔

اللہ کے بندوں سے باتیں ختم ہوتیں تو اللہ سے باتیں شروع ہو جاتیں، اب وہی حجرہ، وہی بندہ، وہی درد و سوز، وہی شعر اور وہی سجدے، وہی سبکیاں اور سسکیاں اور وہی سرگوشیاں، راز و نیاز کی وہی محفلیں اور کیف و مستی کی وہی مجلسیں، خلوتوں میں وہی جلوتیں اور جلوتوں میں وہی خلوتیں۔

افطار کا وقت آتا تو چوبیس گھنٹے بھوکے پیاسے رہنے کے بعد، اس درویش خدا مست کے سامنے جو افطاری پیش کی جاتی، وہ شربت کا ایک پیالہ ہوتا جس میں سوکھی ہوئی سرخ کشمش کے گنے چنے دانے پڑے ہوتے اور اس کے ساتھ گھی میں چپڑی ہوئی سو سو گرام کی جوار کی دو موٹی موٹی روٹیاں، شربت کے تہائی یا آدھے پیالے سے دن بھر کی پیاس بجھاتے، باقی آدھے یا دو تہائی پیالے کو گھونٹ گھونٹ پی کر، آب کوثر پینے کی تمنا دل میں لیے، خدا جانے، کیسے کیسے اور کون کون لوگ، کہاں کہاں سے آئے، کب کب سے انتظار میں بیٹھے ہوتے، جوار کی ایک روٹی حاضرین میں تبرک بٹ جاتی، شربت کے پیالے کی طرح، دوسری روٹی بھی کبھی آدھی اور کبھی تہائی خود کھاتے، باقی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نصیبے والوں کے پیٹ میں پڑتی، مغرب کی نماز با جماعت ہوتی اور پھر وہی محفل سج جاتی، جس میں ادھر مسعود ہوتا ادھر اس کا معبود ہوتا اور دونوں کے بیچ میں خدا جانے کیا ہوتا یا نہ ہوتا۔

پاک پتن کا آسمان روشن تاروں سے جگمگا اٹھتا تو جماعت خانے میں عشائیے یعنی Dinner کے نیچے زمین پر سرخ کپڑے کا ایک دستر خوان بچھا دیا جاتا، روشنی کے لیے، جماعت خانے کے ایک طاق میں سرسوں کے تیل سے بھرا مٹی کا ایک دیا رکھا ہوتا، جس میں پرانی روئی کی پتلی اور پیلی بتی سے سکون بخش ٹھنڈی روشنی نکلتی اور رات کی رانی کی خوش بو کی طرح پورے جماعت خانے میں پھیل جاتی، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ عشائیہ یعنی ڈنر تو ہے مگر دستر خوان نہیں، ایسے موقعوں پر ڈنر زمین پر ہی چن دیا جاتا، کبھی ایسا بھی وقت پڑتا کہ دستر خوان تو موجود ہے مگر عشائیہ نہیں۔

اور یہ عشائیہ یعنی ڈنر ہوتا کیا تھا؟ خواجہ نظام الدین اولیا کے الفاظ میں ''جس رات ہمیں شیخ کے گھر پیٹ بھر کر ''ڈیلے'' کھانے کو مل جاتے، وہ ہمارے لیے عید کا دن ہوتا''، ڈیلے ایک جنگلی پھل کا نام جو ان دنوں پاک پتن کے آس پاس کے جنگلات میں ''کریل'' نام کے درختوں پر خوب اگتا تھا، یہ درخت آج بھی پاک پتن کے قدیم قبرستان کے علاوہ، پاک پتن سے دیپال پور جانے والی شاہ راہ پر نظر آتے ہیں، مقامی لوگ اس درخت کو اب ''کری'' کہتے ہیں، لیکن اس کا پھل آج بھی ''ڈیلے'' ہی کہلاتا ہے۔

ہر ایک کو کھلاتے، گو اکثر خود کچھ نہ کھاتے، انگور بہت پسند تھے لیکن نفس کشی کی وجہ سے کم ہی کھاتے، کبھی کبھی پان بھی کھا لیتے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پان کھانے کا رواج کم از کم آٹھ سو سال پرانا ہے، کھانے کے بعد عشا کی نماز باجماعت ادا کی جاتی اور اس کے بعد اس درویش خدامست کی کٹیا میں اس کی پرانی کھٹیا ڈال دی جاتی، وہ پھٹا پرانا کمبل جسے اوڑھ یا جس پر بیٹھ کر پورا دن گذارا تھا، اب اس کھٹیا پر گدیلے یا توشک کا کام دیتا، تاہم کھٹیا کی پائنتی پر ایک چادر بچھانی پڑتی کیوں کہ یہ پرانا کمبل اتنا چھوٹا تھا کہ پوری چار پائی نہیں ڈھانپ سکتا تھا، اگر رات کی کسی گھڑی پائنتی پر پڑی ہوئی یہ چھوٹی سی چادر اوڑھ لیتے تو ضعیف، بوڑھے اور مقدس پاؤں کے نیچے کوئی بچھونا نہ ہوتا، صرف اور صرف کھری چار پائی ہوتی، ان کے پیر و مرشد خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے جو عصا عطا کیا تھا اسے اپنے سرہانے رکھتے جس پر سر رکھنے سے پہلے کبھی عصا پر عقیدت سے ہاتھ پھیرتے تو کبھی اسے محبت سے بار بار چومتے، اس پر اپنا سفید، ضعیف، تھکا ماندہ سر رکھ کر اپنے محبوب فارسی اشعار گنگنانا شروع کر دیتے، جن کا مفہوم ہے:

''میرے محبوب، میری بس ایک ہی آرزو رہ گئی ہے کہ جب تک جیوں صرف تیری یاد میں جیوں اور جب مروں تو تیرے قدموں میں گر کر تجھے دیکھنے کے لیے زندہ ہو جاؤں، مجھے بتا تو سہی کہ دونوں جہاں میں تیرے سوا میرا بھلا اور کون ہے؟ میں جیتا ہوں تو صرف تیرے لیے، مرتا ہوں تو صرف تیرے لیے''۔

اور پھر ہر رات کی طرح جیسے جیسے فضا میں سکوت اور سکون طاری ہوتا جاتا فرید الدین مسعود کی بے چینی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جاتی، کبھی اپنے دل پسند شعر پڑھتے ہوئے چہل قدمی، کبھی سوز و درد، کبھی پیچ و تاب، کبھی مرشد کے عصا کے والہانہ بوسے، کبھی سکیاں اور سسکیاں، کبھی سجدہ ریزی، کبھی وجد، کبھی پارے کی سی تڑپ اور کبھی رقص بسمل۔

ہر رات کی طرح یہ رات بھی بیت جاتی اور پھر ہر صبح کی طرح پاک پتن کی مسجد سے فجر کی اذان بلند ہوتی، لکڑی کا دروازہ حسب معمول آہستہ سے اندر کی طرف کھلتا، تاروں کی چھاؤں اور صبح کی ٹھنڈی ہواؤں میں یہ نوے سالہ درویش باہر آتا اور مسجد کی طرف روانہ ہو جاتا، سینکڑوں نظریں ان کی سر سے پاؤں تک بلائیں لیتیں، سینکڑوں ہاتھ بے اختیار ایک ساتھ سلام کے لیے اٹھتے، کتنی آنکھیں تھیں جو بھیگ جاتیں، کتنے دلوں کی دنیا دیکھتے دیکھتے بدل جاتی اور وقت تھم جاتا، ساکت ہو جاتا، ساکن ہو جاتا کہ اللہ اکبر! امامت کے لیے امام وقت خود چلا آرہا ہے۔

۱۹۷۳ء میں سرحد پار بھارتیوں نے وہ کیا جس کی توفیق پاکستانیوں کو آج تک نہ ہو سکی، نومبر ۱۹۷۳ء میں بابا فرید میموریل سوسائٹی پٹیالہ نے بابا صاحب کا آٹھ سو سالہ جشن ولادت دہلی، اجمیر اور لکھنؤ میں بڑی دھوم دھام سے منایا جس میں صدر جمہوریۂ ہند سے لے کر بھارت کے وزرا، سیاسی رہنما اور سرکاری عہدے دار سب ہی جوق در جوق شریک ہوئے، اس موقع پر بابا صاحب کی شان میں پانچ اشعار پر مشتمل ایک مختصر اور مشہور نظم پڑھنے کا اعزاز ایک سکھ کے نصیب میں آیا، اشعار یہ ہیں:

اے فرید الدین بابا، اے مرے گنج شکر
عالم الحاد تیرے خوف سے زیر و زبر

تو نے بخشا اک جہاں کو بادۂ عرفاں کا نور
زہد کا، اخلاص کا، تسلیم کا، ایماں کا نور

راہ حق سے اور حق سے تھی شناسائی تری
اس لیے ہوتی ہے ہر دل میں پذیرائی تری

ٹوٹ سکتا ہے نظام انجم و شمس و قمر　　اور مٹ سکتے ہیں دنیا سے یہ دشت و بحر و بر
لیکن اے گنج شکر تو زندہ و پائندہ ہے　　کل بھی تابندہ رہے گا آج بھی تابندہ ہے

اس سکھ کا نام تھا کنور مہندر سنگھ بیدی، اس کا تخلص تھا سحر۔

واہگہ کے سرحد پار کا یہ نام اردو ادب اور شاعری سے ذوق رکھنے والوں کے لیے کوئی اجنبی نام نہیں، یہ ایک انسان کے دل کی آواز ہے جس میں فرید الدین مسعود گنج شکر کی شخصیت اور ان کے پیغام کو ایسے پیش کیا گیا ہے جیسے ایک دریا کو ایک کوزے میں بند کر کے پیش کیا جاتا ہے، جس انسان میں یہ سب اوصاف یک جا ہو جائیں، وہ انسان اس شان سے زندہ رہتا ہے کہ نظام کائنات تو ٹوٹ سکتا ہے لیکن وہ انسان زندہ پائندہ اور تابندہ رہتا ہے اور اس کی آرام گاہ پر صدیوں سے یہ سرمدی نعرہ گونجتا رہا ہے اور گونجتا رہے گا:

حق فرید یا فرید　　حق فرید بابا فرید

نواب صدیق حسن خاں
اور
ان کی عربی لغت نویسی

از ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن☆

نواب صدیق حسن خاں امیر بھوپال (م ۱۳۰۷/۱۸۹۰ء) ہندوستان کے ان مشاہیر علما میں تھے جو تفسیر، حدیث، تذکرہ نگاری اور ادب میں ید طولی رکھتے تھے، ان کا ایک خاص امتیاز یہ بھی تھا کہ وہ اردو، فارسی، عربی تینوں زبانوں پر عبور رکھتے تھے اور تینوں میں نہایت اہم اور گراں قدر تصنیفات و تالیفات یادگار چھوڑی ہیں، کثرت تصانیف کے لحاظ سے بھی ہندوستان تو کیا پورے عالم اسلام میں ان کی نظیر کم ملے گی۔

خاندانی حالات، ولادت نواب صاحب ایک شریف ونجیب اعلی حسینی سادات خاندان کے چشم و چراغ تھے، سلسلۂ نسب ۳۳ واسطوں سے آنحضرت ﷺ تک پہنچتا ہے، نواب صاحب کے دادا سید نواب اولاد علی ریاست حیدرآباد میں نواب نظام علی خاں بہادر کی سرکار میں ایک اعلی عہدے پر فائز تھے، قلعہ گھن پورہ وغیرہ انہیں کی جاگیر میں تھا اور انور جنگ بہادرؔ کے خطاب سے نوازے گئے تھے، ان کے والد بزرگوار مولانا سید نواب اولاد حسن ایک اچھے عالم، صاحب زہد و ورع اور اوصاف حمیدہ کے مالک تھے جو مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے خاص شاگرد اور مولانا سید احمد شہید کے مرید تھے، حلقۂ ارادت میں داخل ہونے کے بعد اپنی قابلیت و ریاضت کی بہ دولت تھوڑے ہی عرصے میں خلافت سے سرفراز کیے گئے، ان کی شادی مولانا مفتی عوض علی (بانس بریلی) کی صاحب زادی سے ہوئی، جن کے بطن سے تین لڑکیاں اور دو لڑکے پیدا ہوئے تھے،

☆ خدا بخش لائبریری، پٹنہ۔

بڑے لڑکے کا نام سید احمد حسن عرشی تھا، دوسرے لڑکے یہی نواب صدیق حسن خاں تھے جوان سے چھوٹے تھے، اسی دین دار، خوش حال اور تعلیم یافتہ گھرانے میں نواب صدیق حسن کی ولادت ان کے ننہال بانس بریلی میں ۱۹/ جمادی الاول ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء کو ہوئی اور یہیں پرورش و پرداخت بھی ہوئی (۱)۔

ابتدائی تعلیم وتربیت نواب صاحب کی ابتدائی تعلیم وتربیت محلّہ کے مدرسہ میں ہوئی، ابھی پانچ سال ہی کے تھے کہ والد بزرگوار کا سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا، سرپرست سے محروم ہونے کی وجہ سے گھر میں غربت وافلاس کے آثار نمودار ہونے لگے، تاہم دینی تعلیم وتربیت کا سلسلہ جاری رہا، انہوں نے میزان ومنشعب سے مختصر المعانی تک کی کتابیں اپنے بڑے بھائی سید احمد حسن سے پڑھیں، اس کے بعد فرخ آباد چلے گئے جہاں انہوں نے مولانا سید احمد علی (جوآپ کے والد بزرگوار کے مریدوں میں تھے) سے کافیہ اور شرح جامی کی تعلیم حاصل کی، اس کے علاوہ قطبی، افق مبین، درمختار، مشکوٰۃ وغیرہ دیگر اساتذہ سے پڑھیں، اس کے بعد یہاں سے کانپور چلے گئے، جہاں دوسری اعلیٰ کتابوں کا درس لیا (۲)۔

دہلی کی روانگی ۱۲۶۹ھ میں کانپور سے دہلی کے لیے روانہ ہوئے، جہاں انہوں نے تقریباً دوسال قیام کیا اور اس مدت میں انہوں نے صدر الافاضل مفتی صدر الدین آزردہ کی خدمت میں رہ کر مختصر المعانی، شرح وقایہ، ہدایہ توضیح تلویح، سلّم، ملاحسن، قاضی مبارک، شرح مطالعے، تحریر اقلیدس، مقامات حریری، مقامات ہندیہ، دیوان حماسہ، سبعہ معلقہ، دیوان متنبی، تفسیر بیضاوی، صحیح بخاری جیسی اہم درسی کتابیں پڑھیں (۳)۔

اجازت حدیث نواب صدیق حسن خاں نے حدیث نبوی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور ہندوستان کے نامور محدثین سے اجازت حدیث کی سند حاصل کی، جن میں شیخ زین العابدین بن محسن بن محمد الانصاری، شیخ عبدالحق محدث بنارسی، تلمیذ قاضی شوکانی یمنی، شیخ یحییٰ بن محمد بن احمد الحاذلی (قاضی عدنان)، قاضی شیخ حسین عرب یمنی اور مولانا شاہ محمد یعقوب دہلوی مہاجر مکی خاص طور پر قابل ذکر ہیں (۴)۔

(۱) مآثر صدیقی، ۱/۴۷، ۵۷، ۶۹، ۱۰۲ (۲) ایضاً ۲/۴، ۵ (۳) ایضاً ۲/۱۰، ۱۲ (۴) ایضاً ۲/۱۷۔

حصول علم کے بعد وہ ۲۱ سال کی عمر میں علوم متداولہ سے فراغت حاصل کرکے دہلی سے اپنے وطن قنوج واپس آئے، یہاں چند ماہ قیام رہا، گھر کے اچھے حالات نہ تھے، معاش اور گزر بسر کے لیے کوئی موروثی اثاثہ بھی نہ تھا، اب گھر کی ساری ذمہ داری ان کے کاندھے پر تھی جو ابھی نوجوان اور ناتجربہ کار تھے، نواب صاحب نے اپنی معاشی بدحالی وذہنی پریشانی کی تصویر خود ہی بڑے دردناک لہجے میں کھینچی ہے، جس کو ان کے لائق فرزند نواب سید محمد علی حسن خاں سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے مآثر صدیقی میں نقل کیا ہے، لکھتے ہیں:

"نہ یارے کہ دراں سراسیمگی جواں مردی نماید ونہ غم گساری کہ دریں افتادگی دستگیری فرماید دریاب ہرکہ راہ بجز چشم کشودن و دیدہ واکردن بے پدری ربوبیت کند در خانہ از نام درہم و دینار پشیزے میسر نہ بود، واحدے از اقارب ہمدرد دل نباشد و راہے بسوئے کسب قوت لایموت نکشاید، وہنرے کہ آلۂ رزق وزندگانی تواند بود حاصل نبود، وبار جملہ خرد وبزرگ خانہ دماند و بود خویش وبیگانہ برسرش افتد حالت دل آں بیچارہ پراگندہ خاطر چہ خواہد بود ؂

نہ قاصدے نہ صبائے نہ مرغ نامہ برے   کہ زبیکسی من نمی برد خبرے" (۱)۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نواب صاحب کے گھر کے حالات کس قدر خراب تھے، حالت کس قدر بدتر تھی، ناچار گھر چھوڑنے کا عزم کیا اور بھوپال کے لیے روانہ ہوگئے، وہاں پہنچ کر تلاشِ معاش میں مصروف ہوگئے، قسمت نے یاوری کی اور چند روز بعد ہی مولانا علی عباس کی سفارش سے انہیں ماہ صفر ۱۲۷۲ھ میں ریاست بھوپال میں ملازمت مل گئی، مشاہرہ تیس روپے ماہانہ طے پایا، نواب صاحب طبعاً نہایت محنتی اور ایمان دار تھے، وفاداری اور وفاشعاری ان کے مزاج میں داخل تھی، اس لیے اپنے فرایض منصبی بہ حسن وخوبی انجام دیتے رہے، یہاں تک کہ تھوڑے ہی دنوں بعد انہیں میر دبیر کے عہدہ پر مامور کردیا گیا، لیکن اتفاق سے اسی دوران حقہ نوشی کے مسئلے پر ان کے اور مولانا علی عباس چریاکوٹی کے درمیان بحث چھڑ گئی، مولانا علی عباس چریاکوٹی اس کی تحریم کے قایل تھے، نواب صاحب گرچہ حقہ نوشی نہیں کرتے تھے تاہم اس کو مباح سمجھتے تھے،

(۱) مآثر صدیقی، ۲/۱۸۔

یہ بحث آگے بڑھی، ناچاقی اور عداوت کی وجہ بنی اور پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ ملازمت سے سبک دوش کر دیے گئے، یہ واقعہ ۱۶/محرم الحرام ۱۲۷۳ھ کا ہے، مجبوراً پھر اپنے گھر قنوج آگئے، یہ ۱۸۵۷ء کا پر آشوب زمانہ تھا جب آزادی ہند کی تحریک پورے شباب پر تھی جسکی لپیٹ میں قنوج اور فرخ آباد کے علاقے بھی تھے، اس کی وجہ سے وہاں کا امن وسکون اور نظم ونسق درہم برہم ہو چکا تھا، اس لیے نواب صاحب نے قنوج چھوڑ دیا اور بلگرام چلے گئے (۱)۔

بلگرام کا قیام اور پریشان حالی

بلگرام پہنچے تو وہاں بھی ایسی تباہی مچی ہوئی تھی کہ کوئی کسی کا پرسان حال نہ تھا، حالاں کہ نواب صاحب کے والد بزرگوار کے متوسلین اور معتقدین کا بڑا حلقہ تھا لیکن وہ خود پریشان حال تھے، نواب صاحب کی مدد کیا کرتے، عسرت اور تنگی اتنی بڑھی کہ فاقہ کشی کی نوبت آگئی، نواب صاحب کے صاحب زادے سید محمد علی حسن خاں نے اس کی بڑی صحیح تصویر پیش کی ہے، لکھتے ہیں:۔

"والا جاہ کوئی مہینہ تک صرف ایک سیاہ جامہ حسن اور نان خشک شبینہ پر وقت گذاری کرنا پڑا، جب کپڑا پھٹ جاتا تا اپنے ہاتھ سے سی لیتے، جب میلا ہو جاتا تو خود دریا پر جا کر دھولاتے، متعلقین کا بھی اس سے زیادہ بہتر حال نہ تھا (۲)"۔

بھوپال کا دوسرا سفر

تحریک آزادی کا ہنگامہ کچھ فرو ہوا تو نواب صاحب اپنے گھر قنوج پھر واپس ہو گئے، وہیں رئیسہ بھوپال سکندر بیگم صاحبہ کا فرمان پہنچا کہ وہ بھوپال آجائیں، جانے کا ارادہ کیا لیکن خرابی موسم کی وجہ سے تاخیر ہو گئی جس کے باعث وہ حکم منسوخ ہو گیا، یہ خبر سن کر نہایت حسرت کے ساتھ پھر وطن واپس لوٹ آئے۔

ٹونک میں قیام

قنوج جاتے ہوئے راستے میں ٹونک آیا، وہاں رک گئے لوگوں نے بڑی پذیرائی کی، نواب وزیر الدولہ امیر الملک محمد وزیر خاں بہادر نصرت جنگ کو جب ان کی آمد کی خبر ہوئی تو نہایت خوش ہوئے، اپنی سرکار میں بلا کر ۵۰ روپے ماہانہ تنخواہ پر کام کرنے کی ہدایت کی اور ٹونک ہی قیام کرنے کے لیے اصرار کیا، نواب صاحب نے کام کرنا شروع کر دیا، لیکن وہاں کی معاشرتی اور سماجی زندگی سے وہ مطمئن نہیں تھے، اس لیے چھٹی کی درخواست دے دی (۳)۔

(۱) مآثر صدیقی ۲/۲۰، ۲۶ (۲) ایضاً ۲/۲۶ (۳) ایضاً ۲/۴۰

بھوپال کا تیسرا سفر

قدرت کی کرشمہ سازی دیکھیے کہ بھوپال سے اب تیسری بار بلاوا آتا ہے، نواب صاحب کو کیا خبر تھی کہ اب کی بار کا سفر انہیں بام عروج پر پہنچا دے گا اور وہ نواب کے اعلیٰ ترین عہدے پر فائز کر دیے جائیں گے، انہوں نے ہامی بھر لی اور بھوپال کے لیے روانہ ہو گئے، ۱۰/صفر المظفر ۱۲۷۶ھ کو وہاں پہنچے، ریاست بھوپال کی طرف سے انہیں ۷۵ روپے ماہانہ تنخواہ پر بحال کیا گیا اور ریاست بھوپال کی تاریخ نویسی کا کام ان کے سپرد کر دیا گیا، نواب صاحب لیاقت وصلاحیت، محنتی وجفاکشی اور ایمان داری کی دولت سے مالا مال تھے، تاریخ نویسی کی خدمت جیسے ہی ان کے حوالے کی گئی، انہوں نے نہایت محنت اور جوش وخروش سے کام کرنا شروع کر دیا، چند ہی دنوں بعد ان کے حسن کارکردگی اور علمی صلاحیت کو دیکھ کر ریاست کے تمام حکام نہایت متاثر ہوئے، خود رئیسہ بھوپال ان کے اخلاق وکردار، دینی ودنیاوی فکر و تدبر، سوجھ بوجھ، وفاداری اور وفا شعاری سے نہایت متاثر ہوئیں، اس کے نتیجے میں انہیں اس سے اعلیٰ عہدے پر ترقی دے دی گئی، اس کے علاوہ مدار المہام منشی جمال الدین کی صاحب زادی سے ان کا نکاح کر دیا گیا، اس طرح نواب صاحب رشتۂ ازدواجی اور ملازمت کی بنا پر بھوپال میں مستقل قیام کرنے کے لیے مجبور ہو گئے، اب سوچا کہ اپنے گھر والوں کو بھی وہیں بلا کر اپنے ساتھ رکھیں، چنانچہ قنوج گئے اور والدہ محترمہ اور بہنوں کو اپنے ساتھ بھوپال لائے اور مستقل طور پر ان کے ساتھ رہنے لگے، اس طرح نہایت پرسکون زندگی گذارنے لگے (۱)۔

نکاح ثانی

اسی دوران میں ایک نہایت اہم اور تاریخی یہ واقعہ پیش آیا کہ بھوپال کی رئیسہ نواب شاہ جہاں بیگم صاحبہ نواب صاحب کی انتظامی صلاحیت اور دینی واخلاقی طور طریقے سے اتنی متاثر ہوئیں کہ امور سلطنت کی دیکھ بھال میں ان کی شرکت کو ضروری خیال کرنے لگیں، وہ جانتی تھیں کہ نواب صاحب میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک ریاست کے ذمہ دار شخص کے لیے ضروری ہوتی ہیں، اس لیے انہوں نے نواب صاحب سے فرمائش کی کہ وہ انہیں اپنا شریک حیات بنا لیں اور بھوپال کے امیر کی حیثیت سے اس ریاست کو ترقی دیں، نواب صاحب تیار ہو گئے اور پھر رئیسہ شاہ جہاں بیگم سے نکاح کر لیا (۲)، اس طرح صدیق حسن خاں

(۱) مآثر صدیقی ۲/۴۲، ۴۳ (۲) ایضاً ص ۲/۸۴۔

اب نواب صدیق حسن خاں ہو گئے اور ریاست بھوپال کے تمام امور کے امیر بن گئے، لیکن اس کے باوجود نہ اس کی دولت وثروت سے متاثر ہوئے اور نہ تعیش پسندی میں مبتلا ہوئے اگران کے دور کے کاموں کا جائزہ لیا جائے تو امور سلطنت سے قطع نظر حسب ذیل تین کام زیادہ اہم نظر آتے ہیں:

۱۔دینی مدارس کی سرپرستی ونگرانی، ۲۔مذہبی وادبی تصنیفات، ۳۔دینی علوم وفنون کی اشاعت۔

دینی مدارس

دینی مدارس ومکاتب ٹکسال کی مانند ہیں جہاں سے علماوفضلا تیار ہوتے ہیں، اس لیے نواب صاحب نے ان کی نگرانی اور دیکھ بھال کی طرف بڑی توجہ دی اور نئے نئے مدارس قایم کرائے، طلبا واساتذہ کے طعام وقیام کا معقول بندوبست کیا، ان کے زمانے میں ریاست بھوپال کے گاؤں اور شہروں میں بہت سارے مدارس قایم ہوئے، جن میں درج ذیل مدارس نہایت اہم تھے:

۱۔مدرسہ بلقیسی: جس میں محروسہ علاقے کے یتیم اور لاوارث بچے تعلیم وتربیت پاتے تھے۔

۲۔مدرسہ سلیمانیہ: جس میں مولوی، عالم، فاضل، مفتی، منشی، فاضل کے درجات کی تعلیم ہوتی تھی اور طلبا اعلی تعلیم سے آراستہ ہوکر نکلتے تھے، ان درجات میں دینی علوم کے علاوہ خوش خطی، انشاپردازی، قانون دانی، حساب اور ریاضی کی بھی تعلیم دی جاتی تھی، جو طلبہ ان درجات میں نمایاں کامیابی حاصل کر لیتے، انہیں حوصلہ افزائی کے لیے وظایف بھی دیے جاتے تھے، چنانچہ انشاپردازی میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے والے طالب علم کو ۱۵ سے ۳۰ روپے اور منشی، فاضل کو ۳۰ سے ۵۰ روپے وظیفے ملتے تھے، ان مدارس میں ہندی کی تعلیم بھی ہوتی تھی اور وظایف دیے جاتے تھے، تمام بچوں کی ضروریات اور صحت کا پورا خیال کیا جاتا تھا(۱)۔

۳۔مدرسہ جہاں گیری: اس کے طلبہ کو سرکاری وظایف دیے جاتے تھے، وظیفہ خوار طلبہ کی تعداد چار سو تھی۔

۴۔مدرسہ صدیقی: اس مدرسہ میں دو سو طلبہ زیر تعلیم تھے اور انہیں مختلف درجات کے لحاظ سے وظایف دیے جاتے تھے۔

ان تمام مدارس میں اچھے اور باصلاحیت اساتذہ کا تقرر کیا جاتا تھا کہ وہ بچوں کو اچھی تعلیم وتربیت دے سکیں، اساتذہ کو پوری یک سوئی کے ساتھ تدریسی خدمات انجام دینے کے لیے

(۱) مآثر صدیقی، ۳/۱۰۹، ۱۱۱

حسب ضرورت تنخواہیں دی جاتی تھیں، بچوں کی ضروریات کا پورا پورا خیال رکھا جاتا تھا، ان کے جسمانی، ذہنی وفکری نشو ونما پر خاص توجہ دی جاتی تھی تاکہ وہ اپنی قوم اور اپنے سماج کی اصلاح کا کام حسن وخوبی سے انجام دے سکیں (۱)۔

دینی علوم وفنون کی اشاعت

دینی علوم وفنون کی نشرواشاعت میں نواب صدیق حسن خاں کی خدمات بہت اہم ہیں، ۱۹ویں صدی میں ہندوستان میں پریس کی تعداد نہایت محدود تھی اور جو پریس تھے ان میں کتابت وطباعت کا اچھا اہتمام نہیں ہوتا تھا، عربی پریس کی تعداد اور کم تھی خاص طور پر نسخ ٹائپ کے پریس بہت ہی کم تھے، ایسی حالت میں کتابیں چھپنا بہت دشوار تھا، لیکن نواب صاحب کا ذوق اس معاملے میں زیادہ بلند تھا اس لیے انہوں نے معیاری اور خوبصورت کتابوں کی طبع واشاعت پر پوری توجہ مبذول کی اور اس میں وہ خاطر خواہ کامیاب ہوئے، دینی ومذہبی کتابوں کی اشاعت سے ان کا اصل مقصد یہ تھا کہ ان سے استفادے کو عام کردیں اور دنیا کو علمائے دین کی خدمات سے واقفیت ہوجائے، اس اہم مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے نادر ونایاب قلمی کتابوں کی خریداری پر خطیر رقم صرف کیں اور تحقیق وتدوین اور تعلیق وتحشیہ کے بعد انہیں ہندوبیرون ہند کے اچھے مطابع سے شایع کرکے مفت تقسیم کیا یا ان کی بہت واجبی اور کم قیمت مقرر کی، اس معاملے میں اپنے اعلا ذوق کی بنا پر کتابت، کاغذ، طباعت، جلد سازی ہر چیز میں نفاست کا پورا خیال رکھا، وہ ہندوستان اور بھوپال کے پریسوں ہی میں کتابیں نہیں چھپواتے بلکہ قسطنطنیہ اور بیروت سے بھی انہیں طبع کراتے اور اخراجات کی کوئی پروا نہ کرتے، انہوں نے مولوی غلام رسول (ممبئی) کو محض کتاب کی طباعت کے لیے مصر اور بیروت بھیجا اور وہاں ان کے مستقل قیام کا انتظام بھی کیا تاکہ اپنی نگرانی میں کتابیں چھپوا کر بھوپال بھیجیں، نواب صاحب نے جن کتابوں کی طباعت پر کافی پیسے خرچ کیے، وہ یہ ہیں، فتح الباری، تفسیر ابن کثیر، نیل الاوطار وغیرہ، پھر انہیں اہل علم میں مفت تقسیم کیا (۲)۔

تصنیفات وتالیفات

نواب صدیق حسن خاں کثیر التصانیف علمائے اسلام میں تھے، ان کی علمی، دینی اور ادبی کتابوں کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہیں، نواب علی حسن خاں کے بیان کے مطابق

(۱) مآثر صدیقی، ۳/۱۱۰ (۲) ایضا ۴/۱۶۸

دوسو بائیس (۲۲۲) کتابیں لکھی تھیں جن کی فہرست مآثر صدیقی حصہ سوم کے آخر میں موضوعات کے تعین کے ساتھ درج کی ہے، یہ کتابیں اردو، فارسی، عربی میں تفسیر، اصول تفسیر، حدیث، اصول حدیث، عقاید، تصوف، فقہ، اصول فقہ، سیاسیات، تاریخ اخلاقیات، تراجم، تذکرہ، ادب، صرف ونحو، لغت اور منطق جیسے موضوعات پر لکھی گئی ہیں، ان کی معروف ترین عربی کتابیں ابجد العلوم، فتح البیان، الاقلید لادلۃ الاجتہاد والتقلید، البلغہ فی اصول اللغہ، اربعون حدیثا، التاج المکلل، حصول المامول، ربیع الادب وغیرہ ہیں، اس مضمون میں صرف ان کی عربی تصنیف کتاب البلغہ فی اصول اللغہ پر بحث وگفتگو مقصود ہے۔

کتاب البلغہ فی اصول اللغہ

کتاب البلغہ عربی لغت کی اہم اور عربی کے ہندوستانی ذخیرے کی ایک بیش بہا کتاب ہے، اس کی قدر ومنزلت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ نواب صدیق حسن خاں نے اس کو نہایت قیمتی کاغذ اور خوبصورت ٹائپ میں ۱۲۹۶ھ میں قسطنطنیہ سے شایع کیا تھا، اس کتاب کی مزید اہمیت اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ معروف مستشرق جرجی زیدان (م ۱۳۳۳/۱۹۰۴) نے اپنی مشہور تصنیف تاریخ آداب اللغۃ العربیہ میں ۱۹ویں صدی عیسوی کے عربی لغت نویسوں کی فہرست میں نواب صدیق حسن خاں کا نام بھی لیا ہے اور ان کے حالاتِ زندگی لکھنے کے بعد اس کتاب کا نام تحریر کیا ہے (۱)، اس کے علاوہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند جلد دوم کے مقالہ نگار پروفیسر عبدالقیوم ہندوستان میں عربی تصنیفات کا جایزہ لیتے ہوئے اس کتاب کو عربی لغت کی اہم تصنیفات میں شمار کیا ہے (۲)۔

کتاب البلغہ دراصل علامہ جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱/۱۵۰۵) کی کتاب المزہر فی علوم اللغۃ وانواعہا کی تلخیص ہے، جو عربی لغت کے فن میں ایک اہم کتاب تسلیم کی جاتی ہے، خود نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے:۔

"متقدمین ومتاخرین علما نے علم لغت کی طرف خاص اعتنا کیا لیکن انہوں نے اس کے اصول وضوابط کی ترتیب وتنظیم کی طرف توجہ نہیں کی، متاخرین علما میں اس کے اصول وضوابط مقرر کرنے والے تنہا علامہ جلال الدین سیوطی ہیں، جنھوں نے المزہر فی علوم اللغۃ وانواعہا

(۱) تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ، ۴/۲۳۸ (۲) تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند، ۲/۴۰۲

نامی کتاب تصنیف اور اس میں علم حدیث کے نہج پر اس فن کو مرتب کیا اور مختلف انواع کے تحت اس کے اصول وقواعد بیان کیے" (۱)۔

اس سے کتاب المزہر کی اولیت واہمیت کا اندازہ ہوتا ہے لیکن یہ ایک ضخیم اور نہایت مفصل ومبسوط کتاب ہے جس میں طول مباحث کے علاوہ غیر ضروری باتیں اور مکررات بھی شامل ہوگئے ہیں اور اس کا انداز بیان اور اسلوب بھی پیچیدہ ہے، جس کی وجہ سے قاری اس میں بیان کردہ اصول وقواعد سے بہ آسانی واقف نہیں ہوسکتا تھا اور وہ حشو وزواید ہی میں الجھ کر رہ جاتا ہے، اس لیے نواب صاحب نے اس کی تلخیص اور ترتیب نو کی ضرورت محسوس کی، جس میں ضروری مباحث ہی سے سروکار رکھا، چنانچہ رقم طراز ہیں:۔

فاردت انتقاءه علی ذلک النظام وافرغته فی قالب الایجاز بحسن الانسجام لتقاصرهم ابناء الزمان عن بلوغ ذروة الکمال و تقاعدهم عن التمسک باذیال کمال العرفان لضیق المجال مع التزام اتمام المعانی وابرام قواعد المبانی ولخصته مطروح الزوائد بمجموع الفوائد مع زیادة نزرة امتلأ بها الوطاب وتصرف یسیر اعلی منه الخطاب (۲)

میں نے اسی نہج پر اس کا انتخاب کیا ہے اور ایجاز کے قالب میں خوبصورتی کے ساتھ ڈھالا ہے، کیوں کہ دور حاضر کے اہل علم کے لیے اس کے کمال تک پہنچنا اور اس کے معانی سے پورے طور پر فیض یاب ہونا محال تھا، میں نے اس کی تلخیص اس طرح کی ہے کہ زاید چیزوں کو ترک کرکے تمام مفید باتوں کو اس کتاب میں جمع کردیا ہے۔

ممکن ہے ظاہر بینوں کو یہ نواب صاحب کا کوئی اہم اور مستقل بالذات کارنامہ نظر نہ آئے لیکن اہل علم جانتے ہیں کہ کسی کتاب کی تلخیص وانتخاب کتنا مشکل کام ہے، کیوں کہ جو کتاب جس فن اور موضوع کی ہو تلخیص نگار کو اس سے بہ خوبی واقف ہونا اور مکمل ماہر ہونا چاہیے اور وہ

(۱) کتاب البلغہ: ۴ (۲) ایضا

اس کے ضروری اور غیر ضروری مباحث پر گہری نظر رکھتا ہو، اسے زبان و بیان پر بھی پوری قدرت ہو، ان امور کو مدنظر رکھنے سے پتا چلتا ہے کہ نواب صدیق حسن خاں نے کتاب البلغہ لکھ کر عربی لغات کی نہایت اہم خدمت انجام دی ہے، کیوں کہ انہوں نے صرف کتاب المزہر کی تلخیص کر دینے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اسے بڑے سہل اور آسان انداز میں پیش کیا ہے اور بعض اہم اضافے بھی کیے ہیں، جو اصل کتاب میں موجود نہیں تھے، جس کی وجہ سے اس کی قدر و قیمت بہت بڑھ گئی ہے اور اس کی ایک الگ شان اور پہچان بن گئی ہے، ذیل میں اس کتاب کی روشنی میں نواب حسن خاں کی عربی خدمات اور لغت نویسی میں ان کے کارناموں کا جائزہ لیا جائے گا اور اس کی اہم خصوصیات تحریر کی جائیں گی۔

۱۔ غیر ضروری مباحث سے اجتناب کتاب البلغہ کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ نواب صدیق حسن خاں نے اس میں ان ہی چیزوں پر اپنی توجہ مرکوز رکھی ہے جو لغوی مسایل کو سمجھنے سمجھانے کے لیے ضروری ہیں اور باقی امور کو حذف کر دیا ہے، اسے سمجھنے کے لیے کتاب المزہر سے اس کا مقابلہ ضروری ہے، مثلاً علامہ سیوطی نے المزہر کو پچاس انواع میں تقسیم کیا ہے اس کی پانچویں قسم میں انہوں نے افراد کی یہ تعریف لکھی ہے کہ کسی لفظ کا کوئی معنی صرف ایک ہی لغوی بیان کرے جس کی تائید دوسرے علمائے لغت نہ کریں تو ہم اسے افراد کہیں گے، اب اگر یہ معنی بیان کرنے والا عالم لغت معتبر و مستند ہو تو اس کا معنی تسلیم کر لیا جائے گا، جیسے ابوزید، خلیل، اصمعی، ابوحاتم، ابوعبیدہ اور اسی پایے کے دوسرے علمائے لغت، اس کے بعد علامہ سیوطی ان علمائے لغت اور دوسرے اہل لغت کے اقوال سے ان کی مثالیں تحریر کرتے ہیں اور صرف ایک دو مثال پیش کرنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ہر ایک کے حوالے سے کئی کئی مثالیں پیش کرتے ہیں اور اسی ضمن میں اور متعدد دوسرے اختلافی مباحث بھی چھیڑ دیتے ہیں جس سے بحث طویل ہونے کے علاوہ پیچیدہ بھی ہو جاتی ہے گو یہ مفید اور پراز معلومات ہوتی ہے تاہم وضاحت کے لیے دو ایک مثالیں بھی کافی تھیں تا کہ اصل مدعا کو سمجھنے میں دشواری نہ ہوتی۔

نواب صدیق حسن خاں کا کمال یہی ہے کہ انہوں نے اس کی تلخیص اس انداز سے کی ہے کہ اس طرح کے پیچیدہ مسایل سے ان کی کتاب گراں بار بھی نہ ہو اور کوئی ضروری بات

چھوٹنے بھی نہ پائے، آیئے دیکھیں کہ نواب صاحب نے افراد کی پیچیدہ بحث کو کس طرح حل کر دیا ہے، وہ اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

وهو ما انفرد بروايته واحد من اهل اللغة ولم ينقله احد غيره وحكم القبول ان كان المفرد به من اهل الضبط والاتقان كأبي زيد والخليل والاصمعي وابي حاتم وابي عبيدة واضرابهم وشرطه ان لا يخالفه فيه من هو اكثر عددا منه مثاله النشبة المال قاله ابو زيد ولم يقله غيره والبداءة قال ثعلب لا اعرفها بالفتح الا عن ابي زيد وحده وامثلة ذالك كثيرة جدا في اقوال اهل اللغة (۱)

افراد وہ ہے جس کی روایت کوئی ایک ہی لغوی عالم کرے اور اسے اس کے علاوہ کسی اور نے نقل نہ کیا ہو اس کا حکم قبول کرنا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ منفرد شخص معتمد و معتبر لوگوں میں ہو جیسے ابوزید، خلیل، اصمعی، ابوحاتم، ابوعبیدہ وغیرہ، اس کی شرط یہ بھی ہے کہ اس کی مخالفت کرنے والے اس سے زیادہ نہ ہوں جیسے النشبۃ المال، ابوزید نے کہا، اس کے علاوہ کسی دوسرے نے نہیں کہا، البداءۃ ثعلب نے کہا کہ ابوزید کے علاوہ کسی دوسرے نے فتحہ کے ساتھ استعمال نہیں کیا، اہل لغت کے یہاں اس کی بہت ساری مثالیں ملتی ہیں۔

اس کی مزید توضیح کے لیے ایک اور مثال ملاحظہ ہو، علامہ سیوطی نے کتاب المزہر کی سینتالیسویں قسم میں ان علمائے لغت کی پہچان بتائی ہے جن کے نام کے اور بھی کئی افراد معروف ہیں، جیسے سیبویہ، اخفش، ثعلب، ابن درید، ابن ہشام، نطفویہ کے نام لکھنے کے بعد ان تمام لوگوں کے نام بھی تحریر بھی کیے ہیں جو ان ہی ناموں سے مشہور ہیں، مثلاً اخفش نام کے گیارہ افراد مشہور ہیں تو امتیاز کے لیے ہر ایک کے نام کے ساتھ اس کا سلسلۂ نسب اور تاریخ وفات بھی لکھ دیا ہے، اس کے بعد وہ جس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے اس کا ذکر کیا ہے، گویا ان تمام اسماء کو احاطۂ تحریر میں لے لیا ہے، جن کے نام تو ایک ہی ہیں مگر مختلف قبائل کے ہیں (۲)۔

(۱) کتاب المزہر ۱/ ۱۳۷، ۱۴۹ (۲) کتاب البلغہ، ص ۳۱ (۳) کتاب المزہر فی انواع اللغۃ ۲/ ۴۶۰، ۴۵۳۔

ظاہر ہے کہ یہ تفصیلات فائدے سے خالی نہیں ہیں، تاہم اس کے لیے ایک دو مثال کافی تھی، لیکن علامہ نے بڑی تفصیل واطناب سے کام لیا ہے، نواب صدیق حسن خاں نے اس کے بہ جائے ایجاز کا اسلوب اپنایا ہے اور قاری کو کم وقت میں زیادہ فایدہ پہنچانے کی کوشش کی ہے، لکھتے ہیں:۔

الاول فیما یتعلق با ئمۃ اللغة	پہلی بات ائمہ لغت اور نحو سے متعلق ہے
والنحو کالاخفش فانہ احد عشر	جیسے اخفش، اس نام کے گیارہ نحوی
نحویا وسیبویه اربعة و ثعلب	ہیں، سیبویہ چار ہیں، ثعلب دو، نطفویہ
اثنان ونطفویه اثنان وابن درید	دو، ابن درید دو، الاعلم دو، ابن یعیش
اثنان والاعلم اثنان وابن یعیش	تین اور ابن ہشام بہت سارے ہیں۔
ثلاثة وابن هشام جماعة (۱)	

۲۔ تقسیم ابواب وترتیب مضامین نواب صدیق حسن خاں نے کتاب البلغہ کے ابواب وفصول کی ترتیب اپنے طور پر قایم کی ہے جو کتاب المزہر کی ترتیب سے قطعاً الگ ہے، علامہ جلال الدین سیوطی نے کتاب المزہر کی تقسیم پچاس انواع میں کی ہے اور اخیر میں ایک خاتمہ ہے، انواع کے ذیل میں بعض بعض جگہ فصل بھی قایم کی ہے اور اس کے تحت لغوی مسایل بیان کیے ہیں، اس کے برخلاف نواب صدیق حسن خاں نے کتاب کا آغاز ایک مقدمہ سے کیا ہے جس میں لغت کی تعریف اور اس کے مبادی پر گفتگو کی ہے، اس کے بعد دو ابواب میں کتاب کی تقسیم کی ہے، باب اول میں لغت کے وہ تمام مباحث تحریر کردیے ہیں جو کتاب المزہر میں پچاس انواع کے ذیل میں بیان کیے گئے ہیں، باب دوم میں لغوی کتابوں کا ذکر ہے، جو بالکل نئی چیز ہے جس کا ذکر کتاب المزہر میں نہیں ملتا، آخر میں ایک خاتمہ ملتا ہے جو اعجاز قرآن اور اس مستنبط علوم پر مشتمل ہے، ایک خاص بات یہ ہے کہ کتاب المزہر دراصل اصول لغت اور اس کے متعلقہ مسایل پر ایک اہم اور بہ قول نواب صاحب پہلی کتاب ہے، لیکن خود کتاب کے عنوان سے اس کی وضاحت نہیں ہوتی اور نہ جن الفاظ سے عنوانِ ابواب قایم کیے گئے ہیں ان سے اصول لغت

(۱) کتاب البلغہ، ص ۹۹

کا پتہ چلتا ہے، کیوں کہ علامہ جلال الدین سیوطی نے لغت کے تمام اصول وضوابط اور مسایل و مباحث کو پچاس انواع میں نوع ہی کے عنوان کے تحت بیان کیا ہے، جس کی وجہ سے اول مرحلہ میں اصولِ لغت کی نشان دہی نہیں ہوتی، اس کے برخلاف نواب صدیق حسن خاں نے جب اس کی تلخیص کی تو اس کمی کی تلافی کے لیے سب سے پہلے کتاب کے نام کو بدل کر کتاب البلغہ فی اصول اللغۃ کردیا تاکہ نام ہی سے اس کتاب کے اصلِ موضوع سے قاری کو واقفیت ہوجائے اور وہ اس کی اہمیت سے بھی باخبر ہوجائے، اس کے علاوہ زیادہ تر ان ہی مسایل کی تلخیص کی ہے جو اصولِ لغت اور اس کے متعلقہ مسایل سے متعلق ہیں، تاکہ پڑھنے والا کم سے کم وقت میں اصول لغت سے بہ خوبی واقف ہوسکے، اس فرق کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم دونوں کے ابواب کا ایک تقابلی مطالعہ کریں، اس لیے ہم یہاں دونوں کتاب کے چند ابتدائی ابواب کے عناوین پیش کرتے ہیں، تاکہ اندازا ہو کہ دونوں کے عنوان اور ترتیب ابواب میں کتنا فرق ہے، پہلے ہم کتاب المزہر نوع اول کے عنوان تحریر کرتے ہیں:۔

النوع الاول، معرفة الصحیح، حد اللغة وتصریفها، واضع اللغة، اصل اللغة من الاصوات، الالفاظ ودلالتها، احتجاج القائلین بالتوقیف، احتجاج القائلین بالاصطلاح، الجواب عن حجج اصحاب التوقیف، الجواب عن حجتی اصحاب الاصطلاح، مأخذ اللغات، الطریق الی علم اللغات، جواز قلب اللغة، متی وقع التوقیف، تعلیم الله آدم اللغات، اللسان الذی نزل به آدم من الجنة، اقسام العرب، قبائل العرب العاربه، حشر الخلائق الی بابل، اول من تکلم بالعربیة، ایحاء اللغة الی النبی ﷺ، الحکمة فی وضع اللغة، الالفاظ المتواردة والمترادفة، السبب فی وضع الالفاظ، حد الوضع، ماذا وضع الواضع؟، هل یجب ان یکون لکل معنی لفظ؟، ما الغرض من الوضع؟، هل الالفاظ موضوعة بازاء الصور الذهنیة؟، لِمَ یوضع اللفظ المناسبة بین اللفظ و مدلوله،

امثلة لمناسبة الالفاظ للمعانی ، متی وضعت اللغة ؟ ، سبب
اختلاف لغات العرب ، الطریق الی معرفة اللغات ، النقل اما
تواترا و آحاد ، شرائط لزوم اللغة ، سعة اللغة ، عدة ابنية الکلام ،
اول من صنف فی جمع اللغة ، نسبة کتاب العین الی الخلیل ، قدح
الناس فی کتاب العین الاستدراک علی العین ، ترتیب کتاب العین ،
کتاب الجیم ، کتاب الجمهرة ، بعض خطبته ، الجمهرة عند ابن جنی ،
تفسیر المولف لعبارة ابن جنی ، الجمهرة عند الازهری ، رأی المولف
فی کلام الازهری هجاء نفطویه ابن درید ، املاء ابن درید الجمهرة ،
نسخة السیوطی من الجمهرة ، نسخة القالی ، اختصار الجمهرة بعض
کتب اللغة الاخری ، کتاب الصحاح ، مجمل ابن فارس ، المحکم و
المحیط ، القاموس ، بعض خطبته .

یہ نوع ۴۷ صفحات پر مشتمل ہے، غور کیجیے اس نوع میں کس وسعت کے ساتھ مسایل لغت
بیان کیے گئے ہیں، اس میں صحیح لفظ کی پہچان بتائی گئی ہے، لغت کی تعریف کی گئی ہے، واضع لغت
کی وضاحت ہے، حضرت آدمؑ کی زبان کی گفتگو ہے، اقسام عرب کی بحث ہے، آنحضرت ﷺ کی
زبان کا بیان ہے، مترادف اور متوارد الفاظ کی تفصیل ہے، لفظ اور اس کے مدلول کے درمیان
مناسبت پر بات چیت ہے، لغت کے وضع کا زمانہ اور لغات عرب کی تعداد اور ان کی پہچان کے
طریقے کا بیان ہے، الفاظ کے تواتر و احاد کی بحث ہے، عربی لغت کی تدوین سب سے پہلے کس
نے کی؟ خلیل کی کتاب العین کیسی ہے؟ کتاب الجیم اور کتاب الجمہرہ کن مباحث پر مشتمل ہیں؟
کتاب الجمہرہ ابن جنی اور ازہری کے خیال میں کیسی کتاب ہے؟ کتاب الصحاح، مجمل ابن فارس،
المحکم، المحیط، القاموس کیسی کتابیں ہیں؟ یہ نوع بلاشبہ مختلف لغوی مسایل پر مشتمل ہے، لیکن انداز
بیان اور ترتیب بیان واضح نہ ہونے کی وجہ سے اصل مدعا سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے، اسی بنا پر
نواب صدیق حسن خاں نے اس کی تلخیص ایک خاص انداز سے کی ہے اور صرف ضروری مباحث سے
تعرض کیا ہے، کتاب البلغہ کے مقدمہ کے عنوانات آپ ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ لغوی

مسایل بیان کرنے میں کتنا صاف اور واضح انداز بیان اختیار کیا گیا ہے اور کتنے ضروری
مباحث ہی تک اپنی توجہ مرکوز کی گئی ہے۔

المقدمه :- فی وصف اللغة وحدها و تصریفها و بعض مبادی
هذا العلم و فیها مسائل :-

الاولی فی وصف اللغة ، الثانیه فی حد اللغة ، الثالثة فی تصریف
اللغة ، الرابعة فی واضع اللغة ، الخامسة فی مبدأ اللغة العربیة ،
السادسة فی بیان الحکمة الداعیة الی وضع اللغة ، السابعة فی
حد الوضع و ما یفاد به ، الثامنة فی ان اللغة لم توضع کلها فی
وقت واحد ، التاسعة فی الطریق الی معرفة اللغة ، العاشرة فی ان اللغة
هل تثبت بالقیاس ، الحادیة عشرة فی سعة اللغة ، الثانیة عشرة اول
من صنف فی جمع اللغة الخلیل بن احمد .

باب اول کے چند عنوانات بھی ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ کس وضاحت اور
منطقیانہ ترتیب کے ساتھ مسایل لغت بیان کیے گئے ہیں:۔

الباب الاول :- فی انواع اللغة و فیه مسائل :-

الاولی فی معرفة ما روی من اللغة و لم یصح ولم یثبت ،
الثانیة فی معرفة المتواتر و الآحاد ، الثالثة فی معرفة المرسل و
المنقطع ، الرابعة فی معرفة الافراد و یقال له الآحاد ، الخامسة فی
معرفة من تقبل روایته ومن ترد فیها مسائل ، السادسة فی معرفة
طرق الاخذ و التحمل وهی ستة ، السابعة معرفة المصنوع ، الثامنة
معرفة الفصیح ، التاسعة فی معرفة الفصیح من العرب ، العاشرة
فی معرفة الضعیف والمنکر والمتروک من اللغات .

اسی طرح بقیہ انچاس ابواب میں بھی علامہ جلال الدین سیوطیؒ کے بیان کردہ مسایل
کے لیے واضح عنوان قایم کیے گئے ہیں اور ان کی تلخیص کی گئی ہے اور صرف ضروری بیانات اور

ضروری امثلہ پیش کی گئی ہیں، بقیہ غیر ضروری مباحث خارج کر دیے گئے ہیں، اسی بنا پر کتاب البلغہ کی عظمت بڑھ جاتی ہے اور عنوان و بیان کے لحاظ سے اس کی ایک الگ حیثیت قایم ہو جاتی ہے۔

۳۔ باب دوم کا ایک مفید اضافہ نواب صدیق حسن خاں نے کتاب البلغہ کے باب دوم میں ایک مفید اور اہم اضافہ کیا ہے جو علامہ جلال الدین سیوطی کی کتاب میں مذکور نہیں، اس اضافے میں ان کتب لغات کا ذکر ہے، جو عربی، فارسی، ترکی اور اردو زبان میں لکھی گئی ہیں، اس میں کتاب اور اس کے مصنف کا تعارف ہے اور سال وفات درج کرنے کا التزام کیا ہے، کہیں کہیں س کے سال طباعت اور مطبع کا نام بھی لکھا ہے اور بعض جگہ آغاز کتاب کی عبارت بھی نقل کر دی ہے، اس کی ترتیب حروف تہجی پر ہے، جو باب الالف سے شروع ہو کر باب الیاء پر ختم ہوتی ہے۔

بعض کتب لغت پر مفصل گفتگو کی ہے اور نہایت مفید اور ضروری معلومات بیان کیے ہیں، اس کتاب کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ عربی، فارسی، ترکی کے ساتھ اردو زبان میں لکھی گئی لغوی کتابوں کا بھی احاطہ کیا گیا ہے، اس میں دوسرے زاید لغوی کتابوں کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے، بعض لغات کے تعارف کے ذیل میں کشف الظنون، کتاب المزہر اور دوسری اہم کتابوں کے حوالے بھی دیے گئے ہیں جس سے قاری کی معلومات میں مفید اضافے ہوتے ہیں، طوالت کا خوف تمام کتابوں کی فہرست پیش کرنے میں مانع ہے، اس لیے صرف ان کتابوں اور مصنفین کے نام تحریر کیے جا رہے ہیں جو ہندوستانی علما کی لکھی ہوئی ہیں اور جن صفحات پر ان کا ذکر ہے، ان کا حوالہ بھی دے دیا ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ ہندوستانی علمانے اس فن پر کتنی گراں قدر کتابیں تصنیف کی ہیں اور کن لغوی کتابوں کا تعارف نواب صدیق حسن خاں نے کرایا ہے، وہ کتابیں یہ ہیں:۔

البرہان القاطع فی لغۃ الفرس (فارسی) : محمد حسین تبریزی حیدرآبادی (ص ۱۰۹)

بہار عجم (،،) ٹیک چند بہار (ص ۱۱۰)

پنج آہنگ (،،) مرزا غالب دہلوی (۱۱۰)

تاج العروس من جواہر القاموس (عربی) محمد مرتضیٰ حسین بلگرامی (ص ۱۱۱)

تاج اللغات — محمد اسماعیل لندنی (ص ۱۱۴)

دری کشا — نجف علی جھجری (ص ۱۲۲)

الشوارد فی اللغۃ — امام رضی الدین حسن بن محمد صغانی (ص ۱۲۵)

شمس اللغات (فارسی، عربی، ترکی) — مسٹر جوزف برتیو جونیر کے لیے لکھی گئی (ص ۱۲۵)

الباب الزاخر واللباب الفاخر — امام حسن بن محمد صغانی (ص ۱۳۶)

غیاث اللغات — محمد غیاث الدین بن جلال الدین رام پوری (ص ۱۳۷)

فرہنگ — ابو منصور علی بن منصور البنارسی (ص ۱۴۰)

فرہنگ — محمود بہاری (ص ۱۴۰)

فرہنگ — عبدالرحیم بہاری (ص ۱۴۰)

فرہنگ جہاں گیری — عضد الدولہ جمال الدین خاں انجو (ص ۱۳۹)

فرہنگ شرف نامہ — احمد منیری معروف بہ ابراہیم الفاروقی (ص ۱۴۰)

القابوس فی ترجمۃ القاموس (فارسی) — حبیب اللہ قنوجی (ص ۱۴۲)

قاطع برہان — مرزا اسد اللہ خاں غالب (ص ۱۴۳)

القول المانوس فی صفات القاموس — مفتی محمد سعد اللہ رام پوری (ص ۱۵۵)

گوہر منظوم (عربی، فارسی) — مولوی محمد علی (ص ۱۶۳)

مجمع البحار فی غرائب التنزیل ولطائف الاخبار (عربی) — محمد طاہر پٹنی (ص ۱۶۵)

مجمع البحرین — امام حسن بن محمد صغانی (ص ۱۶۶)

مصدر فیوض — نذیر الدین شائق (ص ۱۶۹)

مصطلحات الشعرا — وابرستہ لاہوری (ص ۱۶۹)

مفید نامہ — شاہ محمد ولد مسیح الزماں ہانسوی (ص ۱۷۱)

منتخب النفائس

منتخب اللغات — منولال ہندی (ص ۱۷۲)

منتخب اللغات (فارسی) — ملا عبدالرشید حسینی (۱۷۲)

منتہی الارب فی لغات العرب	عبدالرحیم بن عبدالکریم صفی پوری (ص ۱۷۳)
نفائس اللغات	اوحدالدین بلگرامی (ص ۱۷۶)
نورالصباح فی اغلاط الصراح	مفتی محمد سعداللہ مرادآبادی (ص ۱۷۷)
نونول	محمد اسحاق انصاری بھوپالی (ص ۱۷۷)
ہفت قلزم	قبول احمد (ص ۱۷۸)

یہ کل بتیس ۳۲ کتابیں ہیں جن کا تعارف کتاب البلغہ میں کرایا گیا ہے، گرچہ یہ آخری فہرست نہیں ہے کیوں کہ اس کے بعد اس فن پر مزید کتابیں لکھی گئی ہیں، اس کے علاوہ اسی عہد کی کچھ مزید کتابیں ملتی ہیں جو یہاں ذکر کرنے سے رہ گئی ہیں تاہم یہ ضرور معلوم ہوجاتا ہے کہ نواب صدیق حسن خاں کی نظر سے یہ کتابیں گذری تھیں یا ان کے علم میں آئی ہیں جس سے ان کی وسعتِ علمی اور لغت دانی کا ثبوت ملتا ہے۔

۴۔ عام فہم اسلوب بیان نواب صدیق حسن خاں نے لغوی اصول وقواعد نہایت آسان زبان اور عام فہم اسلوب میں بیان کیے ہیں تاکہ قاری کو مسایل سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو، اس سے عربی زبان پر ان کی قدرت کا اندازا ہوتا ہے، یہاں ان کی کتاب کے دو اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں تاکہ ان کے طرز وانداز بیان کا پتہ چلے اور یہ بھی معلوم ہو کہ انہوں نے کس سادگی اور سلیقے کے ساتھ اپنے مافی الضمیر کو ادا کیا ہے، اس کتاب کی آٹھویں قسم فصیح الفاظ کی معرفت و شناخت پر ہے، چنانچہ "الثامنة معرفة الفصیح" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:۔

"الفصح خلوص الشئی مما یشوبه واصله فی اللبن یقال فصح اللبن وافصح فهو فصیح و مفصح اذا تعری من الرغوة و منه، استعیر فصح الرجل ای جادت لغته وافصح تکلم بالعربیة وقیل بالعکس والاول اصح والمفهوم من کلام ثعلب ان مدار الفصاحة فی الکلمة علی کثرة استعمال العرب لها ومثله قال القزوینی فی الایضاح ولا شک ان ذلک هو مدار الفصاحة و رأى المتاخرون من ارباب علوم البلاغة ان کل احد لا یمکنه الاطلاع علی ذلک لتقادم العهد بزمان العرب فحرروا

لذلک ضابطا یعرف به ما اکثرت العرب من استعماله من غیره فقالوا الفصاحة فی الفرد خلوصه من تنافر الحروف و من الغرابة (۱)"

ترجمہ:۔ فصح کسی چیز کے ملاوٹ سے پاک ہونے کو کہتے ہیں، یہ دراصل لبن (دودھ) کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے فصح اللبن وافصح فهو فصیح و مفصح جب وہ ملاوٹ سے خالی ہو، اسی سے فصح الرجل استعارۃً بولا جاتا ہے جس کی زبان عمدہ ہو اور وہ عربی اچھی بولتا ہو، ثعلب کے قول سے پتہ چلتا ہے کہ کلمہ کی فصاحت کا دارومدار عرب کے کثرتِ استعمال پر ہے، اسی طرح کی بات قزوینی نے کتاب الایضاح میں کہی ہے، متاخرین علماے بلاغت نے کہا ہے کہ امتدادِ زمانہ کی بنا پر ہر آدمی کے لیے اس کی واقفیت ممکن نہیں ہے، اسی لیے انہوں نے ایک اصول مرتب کردیا ہے جس سے معلوم ہو کہ کون سا لفظ عربوں کے یہاں زیادہ مستعمل ہے، چنانچہ انہوں نے کہا مفرد لفظ کی فصاحت یہ ہے کہ وہ نامانوس اور اجنبی حروف سے پاک ہو۔

ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجیے، حقیقت ومجاز کی تعریف میں فرماتے ہیں:۔

الحقیقة الکلام الموضوع موضعه الذی لیس باستعارة ولا تمثیل ولا تقدیم فیه ولا تاخر کقول القائل احمد الله علی نعمه و احسانه وهذا اکثر الکلام و اکثر آي القران و شعر العرب علی هذا واما المجاز فهو ما فیه تشبیه و استعارة و کف مالیس فی الاول کقولنا عطاء فلان مزن واکف وهذا تشبیه وقوله تعالیٰ سنسمه علی الخرطوم استعارة وانما یعدل الیه عن الحقیقة لمعان ثلاثة وهی الاتساع و التوکید والتشبیه فان عدمت الثلاثة تعینت الحقیقة ومن ذلک قوله ﷺ فی الفرس هو بحر فالمعانی الثلثة موجودة فیه وکذالک قوله تعالی وادخلناه فی رحمتنا هو مجاز وفیه المعانی الثلاثة (۲)۔

ترجمہ:۔ حقیقت وہ کلام ہے جو اپنی اسی جگہ پر ہو جس جگہ کے لیے وہ وضع کیا گیا تھا، جس

(۱) البلغہ، ۳۵، ۳۶ (۲) ایضا ۵۹۔

میں استعارہ و تمثیل اور تقدیم و تاخیر نہ پائی جائے جیسے کوئی کہے احمد اللہ علی نعمہ و احسانہ، یہ حقیقت ہماری بیشتر گفتگوؤں، قرآن پاک کی اکثر آیتوں اور شعرائے عرب کے زیادہ تر کلام میں ملتی ہے، مجاز وہ کلام ہے جس میں تشبیہ و استعارہ پایا جاتا ہو، مثلاً کوئی شخص کہے عطاء فلان مزن واکف، یہ تشبیہ ہے، اللہ تعالیٰ کا قول ہے سنسمه علی الخرطوم، یہ استعارہ ہے، تین وجوہ سے حقیقت کو چھوڑ کر مجاز کو اختیار کیا جاتا ہے اور یہ تین وجہیں اتساع، تاکید اور تشبیہ ہے، یہ تینوں معدوم ہوں تو حقیقت کہلاتی ہے، اس کی مثال گھوڑے کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ ھو بحر جس میں تینوں معانی موجود ہیں، اسی طرح فرمان خداوندی ہے، وادخلناہ فی رحمتنا، یہ بھی مجاز ہے اور اس میں تینوں معانی پائے جاتے ہیں، یہ دونوں مثالیں اسے سمجھنے کے لیے کافی ہیں کہ نواب صدیق حسن خاں نے آسان اسلوب بیان میں لغوی اصول و مسایل تحریر کر کے جلال الدین سیوطی کی کتاب سے استفادہ ہمارے لیے کس قدر آسان کر دیا ہے۔

دار المصنفین، شبلی اکیڈمی کی نئی کتاب

دار المصنفین کی تاریخ اور علمی خدمات (حصہ اول)

از پروفیسر خورشید نعمانی

دار المصنفین، شبلی اکیڈمی ملک کا ممتاز علمی، ادبی، تحقیقی اور تصنیفی ادارہ اور علامہ شبلی کی یادگار ہے، اس نے اسلامی علوم و فنون، سیرت و سوانح، اسلام اور ہندوستان کی تاریخ اور شعر و ادب سے متعلق مستند و محققانہ کتابیں شایع کر کے اردو لٹریچر میں بیش بہا اضافہ کیا ہے، ان کتابوں نے قوم کی ذہنی و دماغی تربیت بھی کی اور اس کے اندر صحیح علمی مذاق بھی پیدا کیا۔

زیر نظر کتاب میں دار المصنفین کی پر عظمت تاریخ، شان دار خدمات اور ولولہ انگیز علمی کارناموں کو حیطۂ تحریر میں لایا گیا ہے، مصنف شبلی اسکول کے ایک فرد، دار المصنفین کے عظمت شناس اور اچھا علمی، ادبی اور تحقیقی ذوق رکھتے ہیں۔

یہ کتاب دو حصوں میں مکمل ہوگی، حصہ اول کے پہلے باب میں دار المصنفین کا تخیل اور اس کے قیام کی سرگزشت بیان کی گئی ہے، دوسرے باب میں علامہ شبلی اور مولانا حمید الدین فراہی اور دار المصنفین کے رفقا و مصنفین اور منتسبین کے حالات و خدمات درج ہیں، تیسرے باب میں دار المصنفین کی مختلف النوع علمی، ادبی اور تاریخی کتابوں پر مبسوط تبصرہ کیا گیا ہے جس کے شروع کا حصہ اس جلد میں بھی آگیا ہے۔ قیمت: ۱۴۰ روپے

علم انساب

از جناب جنید اکرم فاروقی ☆

اسلام نے مساوات کی تعلیم دی ہے اور بتایا ہے کہ خَلَقَكُم مِن نَفْسٍ وَاحِدَةٍ (قرآن) یعنی تمام انسان کو اللہ نے ایک نفس سے پیدا کیا ہے، دوسری جگہ ارشاد ہے "اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سارے انسان برابر ہیں، کوئی چھوٹا بڑا اور وضیع و شریف نہیں ہے، قرآن کسی خاندان کی فضیلت و برتری کا قایل نہیں، اس نے واشگاف لفظوں میں اعلان کیا ہے لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوا ہر آدمی کا درجہ اس کے کارناموں کے مطابق ہے اور إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو سب سے زیادہ برائیوں سے بچتا ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:۔

لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی۔	کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر (علاوہ نیک عملی کے کوئی نسبی) فضیلت نہیں ہے۔

رسول اکرمؐ نے اپنی اس تعلیم کو عملی زندگی میں برت کر دکھا بھی دیا ہے، حضرت بلالؓ جو حبشی تھے اور غلام رہ چکے تھے ان کی شادی آپؐ نے اپنے خاندان قریش میں حضرت عبد الرحمن ابن عوفؓ (جو عشرۂ مبشرہ میں سے تھے) کی بہن سے کرائی، نیز قریشی جوانوں کی شادیاں بنی بیاضہ (زمانۂ جاہلیت میں کم تر سمجھے جانے والا قبیلہ) میں کرائیں۔

رسول اکرمؐ نے نسبی فخر و مباہات کی سختی سے ممانعت فرمائی کیوں کہ یہ اسلامی روح اور اس کی اخوت و مساوات کی تعلیم کے خلاف ہے لیکن اسی کے ساتھ آپؐ نے نسب تبدیل کرنے والوں پر بھی لعنت فرمائی ہے، ارشاد گرامی ہے:۔

☆ ۲۴۴ - چلہ امروہہ (یوپی)۔

من ادعیٰ الی غیر ابیه فلیتبوأ مقعده فی النار — جو آدمی دوسرے نسب کا دعویٰ کرے وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں دیکھے۔

ہر باشعور آدمی جانتا ہے اور یہی اسلام کی تعلیم بھی ہے کہ دنیاوی عزت اور اُخروی کامیابی کا مدار علم و عملِ صالح پر ہے تاکہ نام و نسب پر کتنے ہی اعلیٰ نسبی کا دعویٰ کرنے والے اپنے برے عمل کی وجہ سے ذلیل و خوار ہیں، اس لیے تبدیلی نسب سے کسی کی عزت میں اضافہ نہیں ہوتا بلکہ اسے لوگوں کے طنز و تمسخر ہی کا نشانہ بننا پڑتا ہے، جب نسبی تبدیلی پر اللہ کے رسولؐ نے لعنت فرمائی اور اسے جہنم میں لے جانے کا باعث قرار دیا ہے تو اس سے عزت کیسے حاصل ہوسکتی ہے، دراصل یہ بڑی بے غیرتی اور بے شرمی کی بات ہے، قرآن مجید میں ہے:۔

فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَیْنَهُمْ یَوْمَئِذٍ — جب صور پھونکا جائے گا تو اس روز لوگوں کے درمیان انساب نہیں ہوں گے۔

انساب تعارف کا ذریعہ ہیں، یہ فخر و عزت کا وسیلہ نہیں، تفاخر کو قرآن نے سخت ناپسند کیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ — اللہ تعالیٰ کسی گھمنڈی اور اترانے والے کو پسند نہیں کرتا۔

قبیلوں اور خاندانوں کا قایم ہونا ایک فطری عمل ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

جَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا — ہم نے تم کو خاندانوں اور قبیلوں کی صورت میں اس لیے بنایا ہے کہ تمہارے درمیان شناخت قایم ہو۔

یعنی یہ پتہ چل سکے کہ کون کس خاندان اور کس کی نسل سے ہے تاکہ مشکلات کے وقت وہ ایک دوسرے کی مدد کرسکیں، ایک حدیث میں ہے:۔

تعلموا انسابکم ما تصلون به ارحامکم — اپنے انساب کو جانو تاکہ اس سے آپس میں رشتے کو جوڑ سکو۔

عرب دنیا کی وہ قوم ہے جس میں سب سے زیادہ انساب کی حفاظت پر زور دیا جاتا

تھا، عرب نسل درنسل تک جانوروں کا نسب بھی یاد رکھتے تھے، اسلام نے اس باب میں افراط و تفریط ختم کردی اور اسے صرف تعارف و تعاون اور صلہ رحمی جیسی خوبیوں کے لیے باقی رکھا، اسی لیے رسول اکرمؐ نے اسے محفوظ رکھنے کی تاکید کی اور آپؐ کے اصحاب میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ عربوں کے انساب کے ماہر تھے بعد میں مسلم نسابین و مورخین نے اسے علم و فن کی ایک مستقل شاخ بنادیا اور اسی موضوع پر مستقل کتابیں لکھیں، انساب تذکرہ و تاریخ ہی کی ایک شاخ ہے اور تاریخ و تذکرہ میں اس سے کافی مدد ملتی ہے، اس لیے ذیل میں اس سلسلے کی ضروری باتیں قلم بند کی جاتی ہیں۔

نسب کا لغوی و اصطلاحی مفہوم لغت میں نسب کے معنی رشتے داری، اصل، نسل اور نژاد کے ہیں، اصطلاحاً باپ کی طرف سے مورثِ اعلیٰ تک کا سلسلۂ آبا نسب کہلاتا ہے۔

علم انساب نسب کی صحت کے اصول و ضوابط اور مختلف خاندانوں کے سلاسلِ نسب کو جاننا علم انساب ہے۔

علم انساب کی غرض و غایت شجرہ ہائے نسب کی حفاظت ان کی ترتیب و تدوین اور تحقیق و تنقید علم انساب کی غرض ہے تاکہ ایک نسب کا آدمی کسی دوسرے نسب کا دعویٰ کرکے حدیثِ رسولؐ کی وعید کے مطابق لعنت کا مستوجب اور جہنم کا سزاوار نہ بنے۔

علم انساب کے فواید ۱- جیسا کہ بتایا گیا علم انساب تاریخ کا جز ہے، کتب تاریخ میں انساب کا ذکر لابد ہوتا ہے، اس لیے اکثر موقعوں پر اس کے ذریعے تاریخ کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

۲- علم انساب کے ذریعے خاندانوں کے شجروں کی صحیح ترتیب قایم ہوتی ہے جس سے تعارف میں آسانی ہوتی ہے، دور تک لوگ ایک دوسرے کو پہچاننے لگتے ہیں، کئی کئی نسلوں کے فرق کے باوجود لوگ اپنے باہمی تعلق کو جانتے اور سمجھتے ہیں۔

۳- اس تعارف سے یہ فایدہ ہوتا ہے کہ ہم نسبی کا جذبہ مصایب میں لوگوں کو اپنے ہم نسب افراد کی امداد پر فطری طور پر آمادہ کرتا ہے، اس کی تائید رسول اکرمؐ کے مذکورہ فرمان سے ہوتی ہے کہ اپنے انساب کا علم حاصل کرو تاکہ آپس میں اچھا سلوک اور خوش گوار معاشرت قایم رکھو۔

۴-کتب انساب سے انسان کو اپنے آبا و اجداد کے حالات و کمالات سے آگاہی ہوتی ہے اور اس میں اپنے آبا کی خوبیوں کی تقلید اور ان کی شرافت کو قایم رکھنے کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اور وہ ان چیزوں سے گریز و پرہیز کرتا ہے جن سے خاندانی وقار کو نقصان پہنچتا ہے۔

۵-آدمی عہد بہ عہد اپنے اجداد کے ناموں اور کارناموں سے واقف ہوتا ہے۔

تمام انسان حضرت آدمؑ کی اولاد ہیں، انہی سے ہر شخص کا سلسلۂ نسب جڑا ہوا ہے مگر کچھ لوگوں نے اسے محفوظ رکھا اور کچھ نے ضایع کردیا، حضرت آدمؑ کی نسل کے بعض اشخاص نہایت صاحب فضل و کمال تھے، ان کی اولاد نے ان سے اپنی نسبت کو فراموش نہیں ہونے دیا اور ان کے بعد کے لوگوں نے اسے سینہ و سفینہ میں محفوظ رکھنے کا اہتمام کیا، اہل علم نے اس کے اصول و قواعد مقرر کیے، اس طرح علم انساب وجود میں آیا۔

نسب کی تحقیق و تنقید کے عام اصول

نسب کی تحقیق و تنقید کے سلسلہ میں یہ اصول مدنظر رکھنا چاہیے:۔

۱-عموماً سلسلۂ نسب کے اندر سو سال میں تین کڑیاں ہونی چاہئیں یا دو سو سال میں کم سے کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ سات ہونی چاہئیں، کبھی کبھی آٹھ بھی ہوجاتی ہیں۔

۲-صحت نسب کے لیے تواتر ضروری ہے، نسبی تواتر میں شمار ہونے والی چیزیں یہ ہیں کہ کتب انساب میں خاندان کا تذکرہ ہو یہ اگرچہ قلمی ہوں لیکن مستند ہوں، دوسرے تاریخ و تذکرے کی کتابوں میں کسی بزرگ کے حالات میں نسب کا ذکر کیا گیا ہو، عہد بہ عہد دستاویزات میں نسبی اشارا ہو۔

۳-نسب کی تحقیق میں شہرت کا سب سے بہت اہمیت ہے، کم سے کم اپنے علاقے میں اس کی شہرت ضرور ہو، باشعور، ثقہ اور نسب داں لوگ اس سے واقف ہوں۔

شہرت اور تواتر لازم و ملزوم ہیں، نسب کی صحت کے لیے شہرت اور تواتر کا ہونا لازمی شرط ہے، یہ دونوں ایسے قرینے ہیں جن کی وجہ سے نسب نامے پر یقین کی مہر ثبت ہوتی ہے ورنہ وہ ظن کی حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا، علم حدیث میں تواتر اور شہرت کی اہمیت اسی لیے ہے کہ ان کی وجہ سے خبر نص کے درجے تک پہنچتی ہے، یہ دونوں قرینے نہ ہوں تو کوئی بھی آدمی اپنا شجرہ تیار کرکے کسی مشہور نسب میں ہونے کا دعویٰ کرسکتا ہے، اسی لیے ثبوتِ نسب کے واسطے صرف

نسب نامے کا ہونا بے سود ہے۔

۴-اگر دوسرے ملک کا کوئی آدمی اپنا نسب نامہ پیش کرے اور اس میں کچھ شک و اشتباہ ہو تو اس کے وطن کے ثقہ لوگوں کی تحریری شہادت ضروری ہے، شہادت کا انداز مدلل ہونا چاہیے۔

۵-کسی غیر متعلق شخص سے نسبت کے لیے قطعی ثبوت (مستند اور صحیح دستاویز وغیرہ) ضروری ہے۔

۶-تاریخ و انساب کی کتابوں میں بعض افراد کے نام سہواً رہ جاتے ہیں، اس طرح کے آدمی کی صحت نسب کے لیے اس خاندان کے معتبر لوگوں کی تصدیق ضروری ہے۔

۷-اگر کسی خاندان کا تذکرہ قدیم کتب میں نہ ہو لیکن بعد میں اس کے کسی فرد یا افراد کو کوئی اعزاز حاصل ہوا اور اس کے بعد کئی کتابوں میں ان کے نسب کا ذکر ہوجائے تو یہ چیز تواتر اور شہرت میں شمار نہ ہوگی بلکہ دیگر قراین دیکھے جائیں گے۔

۸-اس وقت صحابہ کرامؓ تک منتہی ہونے والے شجروں میں چالیس سے پینتالیس تک نام پائے جاتے ہیں، ان چالیس پینتالیس افراد کے درمیانی سلسلے میں چند یا کم سے کم ایک دو ہی ایسے افراد ہونے چاہئیں جو اپنے زمانے میں معروف ہوں، عالم گیر اور کسی بڑے خطے میں نہ سہی اپنے محدود علاقے ہی میں ان کی شہرت ہو، سلسلۂ نسب کی جہت میں ان کی حیثیت شہتیر جیسی یا کسی تاریک راستے کے بیچ میں مشعل جیسی ہوتی ہے جس سے دونوں سمتیں روشن ہوتی ہیں۔

۹-نسبی معاملات کے ثبوت میں خواب کی کوئی اہمیت نہیں ہے چاہے کسی مقدس بزرگ ہی کے خواب کیوں نہ ہوں، کیوں کہ خوابوں سے کسی بات کی تائید یا تردید نہیں ہوسکتی۔

۱۰-وہی زبانی روایات تسلیم کی جاسکتی ہیں جو احوال و کوائف اور آثار و قراین کے موافق ہوں، اسی طرح خاندانی بیاضوں کے مرقومات اور دستاویزات کی نقول (اصل کی عدم موجودگی میں) آثار و قراین کے موافق ہونے پر قابل قبول ہوں گی۔

ہندوستان میں آباد غیر ہندوستانی خاندان

عرب و ایران وغیرہ کے بہت سے جو خاندان نقلِ مکانی کرکے ہندوستان میں کئی صدیوں سے آباد ہیں، ان کے انساب کی جانچ پرکھ کے لیے کچھ مزید باتوں کو بھی دھیان میں رکھنا ہوگا، اس لیے ان کو الگ سے تحریر کرنا

مناسب ہوگا۔

۱-اس شہر میں ان کے مورث کی معروف یادگار و آثار، ان کی کوئی تالیف یا تعمیر وغیرہ بڑے آثار میں شمار ہوں گی، اگر یہ موجود نہ ہو تو کم سے کم کسی قدیم دستاویز یا بیاض وغیرہ میں ان کا ذکر یا نام ملتا ہو، ان کی قبر بھی اہمیت کی حامل ہوگی۔

۲-مورث کے نقل مکانی کی وجہ سے تحریری یا سماعی طور پر لوگ باخبر ہوں، سماعی روایتوں میں تواتر اور یکسانیت ہونی چاہیے، ایک وجہ کو اگر کئی اشخاص بیان کریں تو لوگوں کے بیان میں تضاد نہ ہو (یہ وجہ فراموش بھی ہوسکتی ہے)۔

۳-کسی خاتون نے جس مقام سے نقل مکانی کی ہو وہاں ان کے خاندان کے جو افراد ہوں یا اور دوسری جگہوں میں آباد ہوں وہ اپنا جو نسب بیان کرتے ہوں ان میں کوئی تضاد ہو تو اس کی وجہ کی وضاحت ہونی چاہیے، اس طرح کی صورتیں اب ہندوستان ہی کے مختلف شہروں میں معروف خاندانوں کے نقل مکانی کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہیں، عرب و ایران میں ان باتوں کا پتہ لگانا ذرا مشکل ہے، لیکن پاکستان کے مہاجر خاندانوں کے لیے اس اصول کی زیادہ اہمیت ہے۔

۴-مورث کے نقل مکانی کا زمانہ اور اس وقت سے اب تک کے سلاسل کی تعداد نیز زمانے کے حساب سے افراد خاندان کی تعداد اور اگر تعداد کم ہے تو اس کے اسباب، مثلاً ایک خاندان ایک جگہ پانچ سو سال سے آباد ہے تو اس کے افراد کی تعداد کم و بیش اتنی ہی ہونی چاہیے جتنی فطری طور پر پانچ سو سال میں ہوسکتی ہے، اگر وہ اس سے زیادہ کم ہے تو اس کی معقول وجہ کیا ہے؟۔

۵-اپنے زمانے اور اپنے بعد مورث کا اسی نسب میں مشہور ہونا جس کا دعویٰ بعد کے لوگ کر رہے ہیں، یعنی مورث کے نسب کی شہرت اخلاف کے دعوے کے خلاف نہ ہو، اگر ایسا ہو تو مخالفت کے مضبوط اور قطعی دلایل پیش کیے جائیں۔

۶-تحقیق انساب میں ۱۸۵۷ء کے بعد کو خاص طور پر نگاہ میں رکھنا چاہیے، کیوں کہ اس دور میں تبدیلیِ نسب میں تیزی آئی ہے یہی صورت ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان میں ہجرت کے بعد بھی پیش آئی ہے۔

۷-انیسویں صدی کے آخر تک کی دستاویزات میں نام کے ساتھ لفظ شیخ کی بہت اہمیت ہے، اس ذیل میں مورخ امروہہ جناب محمود احمد عباسی کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

''لفظ شیخ اصل میں بزرگ و بزرگی اور بزرگ زادگی کے معنی میں مستعمل تھا اور ہندوستان میں ابتداءً عربی النسل خاندانوں کے افراد تک محدود و مخصوص تھا، ہندی نژاد شریف اقوام کے صرف ان افراد کے لیے شیخ کا لقب استعمال کیا جاتا تھا جو علوم شریعت و طریقت میں درجۂ امتیاز حاصل کرلیتے تھے، رفتہ رفتہ ہندی النسل مسلمان شرفا کے بعض خاندان جو علما اور مشائخ کی نسل سے تھے، لفظ شیخ سے ملقب ہونے لگے لیکن اسلامی حکومت کے آخری دور تک شرفا کے سوائے...... دوسری ہندی الاصل پیشہ ور اقوام کے لیے یہ لفظ کبھی اور کسی حالت میں استعمال نہ کیا جاتا تھا''۔ (تحقیق الانساب، ص۱۴)

آخری دور تک لفظ شیخ عربی النسل خانوادوں میں صدیقی، فاروقی، عثمانی، علوی، عباسی، جعفری، انصاری اور عجمی النسل میں ترک کمان اور ایرانی قبایل (۱) نخشی وغیرہ اور ہندی النسل میں کنبوہ کلال وغیرہ کے ناموں کے ساتھ بالعموم مستعمل تھا، اس عہد کی دستاویزات میں لفظ شیخ کے بعد دیگر قراین سے نسب کی تعیین کی جائے گی۔

۸-نسبی تحقیق و تنقید میں شاہی فرامین و اسناد جو کسی خاندان کو عطا کی جاتی تھیں یہ اور دوسری دستاویزات اور تحریریں بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں، ان کے ذریعے آسانی سے نسب کا سراغ لگ جاتا ہے۔

مندرجہ بالا اصولوں کے مطابق جب کسی نسب کی تحقیق و تنقید کی جائے گی تو وہ علمی، عقلی اور معروضی کہلانے کی مستحق ہوگی، نسب کے معاملات میں قدیم خاندانی دولت و ثروت کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا، اسی طرح صرف علم و فضل کی قدامت بھی نسب کے معاملات میں معیار نہیں بن سکتی، یہ کسی قرینے کو تقویت تو پہنچا سکتی ہے لیکن نسب کے لیے مجرد یہی قرینہ کافی نہیں ہے، یہ تو خدا کا فضل ہے وہ کسی کو بھی دے سکتا ہے اور کبھی بھی دے سکتا ہے، ہندی الاصل خاندانوں میں بھی صدیوں پہلے سے صاحبانِ علم و فضل ہوتے رہے ہیں۔

(۱) اہل ایران میں خاندانی نسبت کا کم اور شہری نسبت کا زیادہ رواج تھا (مقدمہ ابن خلدون)۔

شکل شباہت، چہرے مہرے اور جسمانی ساخت سے بھی کسی کے نسب کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، عام مشاہدے کی بات ہے کہ خوبصورت والدین کے یہاں کم صورت اور کم صورت والدین کے یہاں خوبصورت اولاد پیدا ہوتی ہے، گوروں میں کالے اور کالوں میں گورے پیدا ہوتے ہیں، راقم نے کشمیری الاصل لوگوں کی اولاد گورکھائی انداز کی دیکھی ہے اور گورکھا رجمنٹ میں ایسے جوان دیکھے جو گورکھا نژاد ہونے کے باوجود گورکھوں سے مختلف ناک نقشے اور قد و قامت کے تھے۔

عادت و سیرت بھی کسی طبقے کی مخصوص وراثت نہیں ہوتی، صداقت و عدالت، سخاوت وشجاعت، غیرت وحمیت وغیرہ جو لازمۂ شرافت ہیں تمام انسانوں میں عام ہیں، ان کا ظہور کہیں بھی ہوسکتا ہے، ان کے برعکس خصایل ذمیمہ کا مظاہرہ کوئی بھی کرسکتا ہے، پھر بھی یہ امر واقعی ہے کہ باپ دادا کے صوری اور جسمانی اثرات کچھ نہ کچھ اولاد میں پائے جاتے ہیں، اسی طرح ان کے خصایل وشمایل بھی اولاد میں آسکتے ہیں، مشہور ہے باپ پر پوت پتا پر گھوڑا بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا، پھر بھی یہ چیزیں نسب کی تعیین یا اس کی تحقیق وتنقید میں نہ معاون ہیں اور نہ ضروری، ان سے قدیم مورث کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔

نسب کی اقسام بنیادی طور پر نسب کی حسب ذیل دو قسمیں ہیں:۔

۱-معروف: جس نسب کا علم ہو، ۲-مجہول: جس کا علم نہ ہو۔

پھر نسب معروف کی دو قسمیں ہوگئی ہیں، ۱-جس نسب کے سلسلوں کی تعداد مکمل اور صحیح ہو تو اسے نسب متصل اور صحیح کہا جائے گا، ۲-لیکن جس نسب کے سلسلوں کی تعداد غیر مکمل یا غیر صحیح ہو تو یہ نسب منقطع ہوگا، جس کی دو قسمیں ہیں، نسب میں انقطاع اضطراری ہوگا یا حقیقی ہوگا۔

انقطاع اضطراری بعض اوقات نقل مکانی ایسے حالات میں ہوتی ہے کہ افراد خاندان اپنے ساتھ اپنے اثاثے منتقل نہیں کرپاتے یا شجرہ ہائے نسب کسی وجہ سے تلف ہوجاتے ہیں اور بعد میں جب اسے یادداشت سے تحریر کیا جاتا ہے تو اس صورت میں وسایط کے اندر تقدیم وتاخیر یا ترک وغیرہ کا امکان قوی ہوجاتا ہے، لہذا کچھ کڑیاں چھوٹ جاتی ہیں اور نسب میں انقطاع واقع ہوجاتا ہے، ایسی صورت میں اس خاندان کی شہرت کو دیکھا جائے گا نیز دیگر احوال وقراین

پر بھی نظر کی جائے گی، اگر یہ باتیں دعوے کے موافق ہیں تو قلت وسایط وغیرہ کو نظر انداز کردیا جائے گا اور اس نسب کو قبول کرلیا جائے گا اور اسے مقبول النسب کہیں گے۔

انقطاع حقیقی کوئی فرد اپنا سلسلہ نسل کسی دوسرے خاندان کے مورث سے ملائے اور ہوشیاری کے ساتھ وسایط کی تعداد پوری کرتے ہوئے شجرۂ نسب بھی بنالے لیکن یہ شجرہ جعلی ہونے کی وجہ سے غیر صحیح ہوگا، اس کے جعلی ہونے کا اندازہ مندرجہ بالا اصول انساب کی روشنی میں ناقد کو آسانی کے ساتھ ہوسکتا ہے لہذا ایسا نسب منقطع حقیقی مانا جائے گا اور اسے رد کردیا جائے گا اور ایسی جسارت کرنے والے مردود النسب کہلائیں گے جو مجہول النسب ہونے سے بھی بدتر اور قبیح ہیں۔

مندرجہ ذیل شجرے سے نسب کی قسموں کی تفہیم بہ آسانی ہوسکتی ہے:۔

- نسب
  - معروف
    - متصل
      - صحیح النسب
    - منقطع
      - انقطاع اضطراری — بہ وجہ شہرت مقبول
      - انقطاع حقیقی — بہ وجہ جعل مردود
  - مجہول
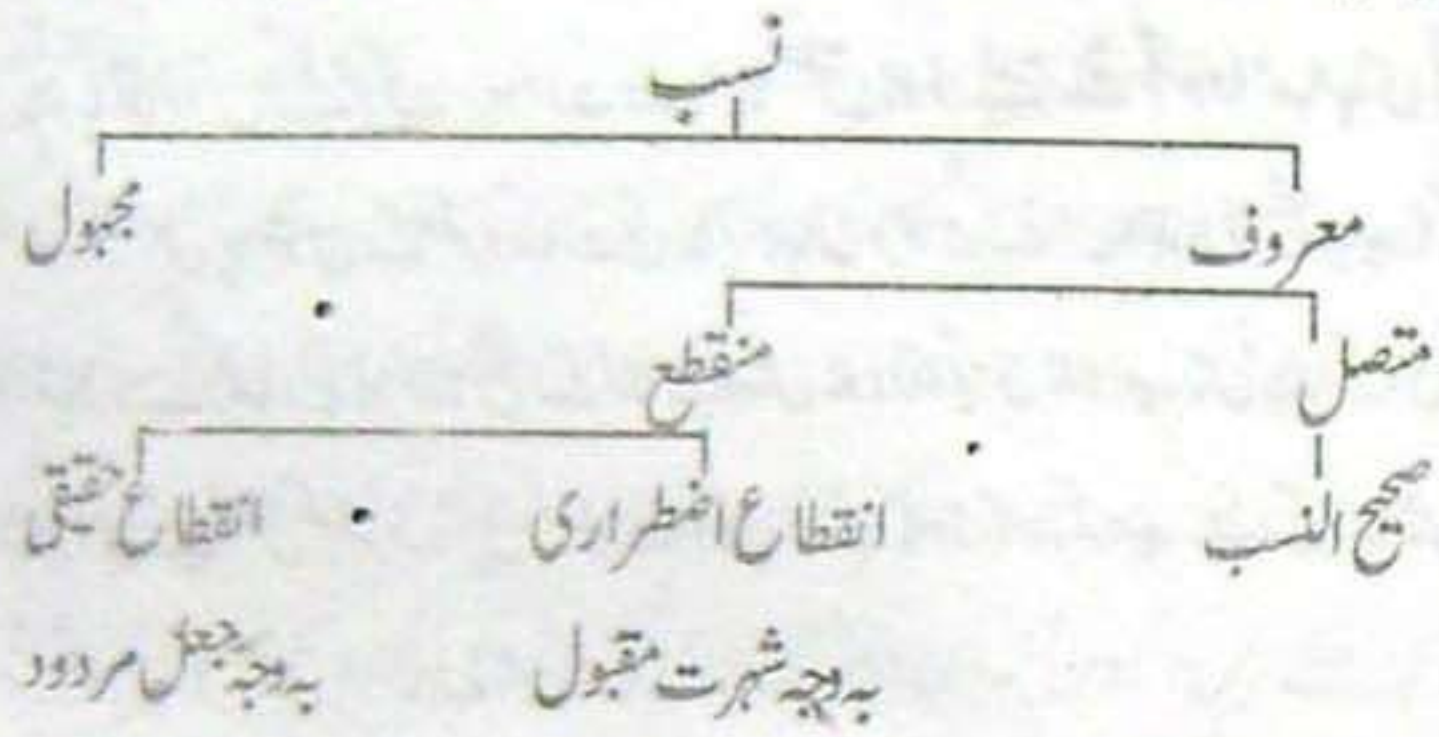
مذکورہ تقسیم سے چار قسم کے نسب ثابت ہوتے ہیں:۔

صحیح النسب:- وہ خاندان جس کا سلسلۂ نسب اپنے مورث اعلیٰ تک متصل ہو اور اسے شہرت و تواتر کی سند بھی حاصل ہو۔

مقبول النسب:- وہ خاندان جس کا سلسلۂ نسب کسی وجہ سے غیر متصل یا غیر صحیح ہو لیکن شہرت اور دیگر قراین کی وجہ سے مقبول ہو، مثلاً کسی معتبر کتاب میں اس کے نسب کا ذکر ملتا ہو، لہذا یہ نسب صحیح ہی کے درجے میں ہوگا، کیوں کہ اصل میں یہ وہی ہے۔

مردود النسب:- وہ خاندان جو دراصل مجہول النسب ہے لیکن اس کے باوجود کسی دوسرے خاندان سے ہونے کا جھوٹا دعویٰ پیش کرتا ہے خواہ وہ کہیں درج ہوجائے۔

مجہول النسب:- وہ خاندان جس کے نسب کا کوئی قدیم علم نہ ہو چاہے ان کی چھ سات پشتوں

کے یا اس سے کچھ زیادہ نام ان کے کاغذات سے معلوم بھی ہو جائیں۔

• ہندوستان میں ۱۸۵۷ء بلکہ اس کے بہت بعد تک بھی نسب بدلنے کا عام رجحان رہا ہے، اس کے چند وجوہ ہیں:۔

• ۱- عالی نسبی کے لیے لوگ اپنے کو سید ظاہر کرتے اور آل رسولؐ سے اپنا تعلق جوڑ لیتے۔

۲- صوفی حضرات حضرت علیؓ کی اولاد سے اپنا تعلق دکھا کر تصوف میں اپنی برتری ظاہر کرتے تھے۔

۳- آخر میں شیعیت کے غلبے نے ان تصورات کو زیادہ جان دار اور چمک دار بنا دیا تھا، اس عہد کے امرا اور نوابین کی نگاہ میں بھی سید ہونا بڑے فخر و شرف کی بات تھی۔

۴- نسبی اونچ نیچ کے تصور اور سیادت کی افضلیت کے پروپگنڈے نے بھی سیادت کو دلآویز بنا دیا تھا، اس لیے لوگ سادات سے اپنا تعلق جوڑ لیتے تھے، محمود احمد عباسی لکھتے ہیں:۔

"نسل پرستوں کے مفروضات کی بنا پر جہال و عوام نے ان الفاظ (شیخ، سید) کو جو فرق و امتیاز دے رکھا ہے نیز لفظ شیخ کے مقابلے میں جو دلآویزی لفظ سید میں پیدا کر دی گئی ہے، شاید اسی لیے بعض کم ظرف اپنی اصلیت اور اپنا نسب چھوڑ چھوڑ کر سید بننے کے خبط میں مبتلا نظر آتے ہیں" (تحقیق الانساب، ص ۱۶)۔

۵- شیعیت کے بول بالا کے زمانے میں صدیقی، فاروقی، عثمانی اور عباسی ہونا کوئی اہمیت تو درکنار جرم سمجھا جاتا تھا، اس بنا پر اس عہد میں ان لوگوں کے نسب کے اظہار کے لیے لفظ شیخ مخصوص کیا گیا، بعد میں اسے اور وسعت دی گئی، اس بات کی توثیق کے لیے ملاحظہ ہو امروہہ کے اہل تشیع کی ایک دستاویزی تحریر مرقومہ ۱۸۶۵ء کا اقتباس۔

"۲۷ ربیع الثانی ۱۲۸۲ھ بروز چہار شنبہ بر مکان سید حسن صاحب رئیس امروہہ تجویز ہوا، انجمن سادات نقوی مجلس شوریٰ (۶) نے جلسۂ عام میں متفق الرائے ہو کر طے کیا کہ اہل شیعہ حضرات یعنی سادات امروہہ بہر صورت اس بات کا خیال رکھیں کہ ....

۲- اپنی تحریروں میں دوسروں کی قومیت کا اظہار شیعہ حضرات کی جانب سے ہرگز نہ ہو۔

۳- سنیوں کی اقوام کو شیخ کہنا چاہیے چاہے وہ پست ہی اقوام ہوں۔

نشست و برخاست میں گفتگو میں اس پابندی کا خیال بہت ضروری ہے الخ" (عکس و نقل کے لیے ملاحظہ ہو تحفۃ الانساب، مولفہ مصباح احمد صدیقی ص ۲۷۱ و ۲۷۲)۔

دوسروں کی قومیت کا اظہار ہرگز نہ ہو یعنی انہیں صدیقی، فاروقی، عثمانی، عباسی وغیرہ نہ لکھا جائے، صرف شیخ سے کام لیا جائے، لہٰذا ایسے ماحول میں جس مجہول النسب کو بھی اعلیٰ نسبی کا دعویٰ کرنا ہوتا تھا وہ سیادت کے علاوہ اور کسی نسب پر کیوں قانع ہوتا، "غلہ ارزاں" ہونے کی وجہ سے کچھ تعلیم حاصل کر کے فارغ البالی میسر آنے پر نقل وطن کر کے سید بن جاتا تاکہ اسے امرا کی نگاہوں اور معاشرے میں معزز سمجھا جائے۔

۱۸۵۷ء کے بعد سید کی طرح صدیقی بننے کی لہر بھی آئی جو شروع میں ہلکی اور بعد میں تیز ہو گئی، یہ لوگ صرف سنی ہی ہو سکتے تھے، کیوں کہ سنیوں کا عقیدہ ہے افضل البشر بعد الانبیاء بالتحقیق امیر المومنین ابی بکر الصدیقؓ، تصوف کے سلسلۂ نقش بندیہ میں حضرت صدیقؓ کا وہی مقام ہے جو چشتیہ قادریہ میں حضرت علیؓ کا ہے لیکن سید کی طرح اس سے فواید وابستہ نہ تھے، اس لیے ۱۸۵۷ء کے آس پاس جو لوگ خود کو فاروقی، صدیقی، عثمانی، عباسی کہہ رہے تھے ان کے دعوے میں صداقت کا قوی امکان ہے جس کو دیگر قراین مزید قوی کہہ سکتے ہیں، کیوں کہ اس دور میں وہی شخص خود کو مذکورہ کسی نسب میں شامل کر سکتا تھا جس کا تعلق واقعی اس نسب سے ہو اگر اسے جھوٹا دعویٰ کرنا ہوتا تو اس ماحول کے لحاظ سے سیادت کا دعویٰ کرتا، کیوں کہ اس ماحول میں خود کو سید کے علاوہ اور کچھ کہہ کر کوئی فایدہ حاصل نہیں کر سکتا تھا، ایسے حالات میں جو لوگ اپنے کو صدیقی وغیرہ کہتے تھے ان کا دعویٰ قابل لحاظ ہو سکتا ہے، کیوں کہ ممکن ہے نقل مکانی میں وہ لوگ اپنے خاندان سے بچھڑ گئے ہوں۔

اگر ایسے لوگوں کے پاس شجرہ نسب نہیں ہے یا غیر متصل ہے اور کسی قدیم نسبی کتاب میں ان کا ذکر نہیں ہے تو بھی ان کے دعوے کی تردید میں تامل کیا جائے گا ممکن ہے ان کا یہ دعویٰ صحیح ہو اگر حالات ایسے ہوں کہ قراین سے کسی نتیجے پر پہنچنا ممکن نہ ہو تو اسے دیکھا جائے گا کہ کیا اسی زمانے سے ان کی شادیاں صحیح النسب اور مقبول النسب خاندانوں میں ہو رہی ہیں اور اہل شہر اپنے بزرگوں سے ان کا یہی نسب سنتے آرہے ہیں تو تواتر سماعی اور شہرت عام کی وجہ سے

انہیں شریف النسب تسلیم کیا جائے گا بشرطیکہ اس میں کوئی امر قوی مانع نہ ہو۔

ہندوستان آنے والے مسلم خانوادوں کے زمانے کی تعیین تحقیقِ نسب میں بہت معاون ہوسکتی ہے گو مسلم حکومت کے قیام سے پہلے ہی یہاں مسلمانوں کی آمد شروع ہوگئی تھی، لیکن حکومتیں قایم ہونے کے بعد ان کو استحکام دینے کے لیے حکمرانوں نے یہاں مسلم خاندانوں کی آبادکاری کو ضروری سمجھا، شاہی افواج کے علاوہ اشاعتِ دین اور اجرائے سلاسل کے لیے بھی مبلغ علما اور صوفیہ کی یہاں آمد ہوئی، قضا و افتا وغیرہ کی خدمت انجام دینے کے لیے باہر سے اہل علم وفضل بلائے گئے، قضا، خطابت اور احتساب و امامت جیسے مذہبی عہدوں پر خالص طور سے قریشی النسل لوگ ترجیحاً مامور کیے جاتے تھے۔

منگولوں کی یورش اور بلادِ اسلامیہ سمرقند و بخارا، بغداد وغیرہ کی تباہی کے بعد بہت سے خاندانوں نے ہندوستان کی طرف رخ کیا کیوں کہ اس وقت ہندوستان دار الامان تھا، یہاں کی حکومت مضبوط اور سلاطین طاقت ور تھے، جنھوں نے ہمیشہ منگولوں کو شکست دی، بعض افراد کو ہندوستان کی خوش حالی اور یہاں کے سلاطین کی داد و دہش بھی یہاں کھینچ لائی۔

عربی النسل خاندانوں کی آمد زیادہ تر عہدِ سلاطین، غلامان خلجی، تغلق اور لودھی میں ہوئی (ملاحظہ ہوں فتوح السلاطین از عصامی، تاریخ فیروز شاہی از برنی، تاریخ فرشتہ، اخبار الاخیار وغیرہ)، مغلوں کے عہد میں ایرانیوں کی آمد کا سلسلہ زیادہ رہا، عربوں کا آنا اس وقت خال خال ہی ملتا ہے۔

قدیم خاندانوں کا پھیلاؤ، ان کی تاریخ اور ان کے آثار ان کے صحیح و صادق ہونے کی دلیل ہیں مگر ان کے برخلاف شہروں میں کچھ چھوٹے خاندان پائے جاتے ہیں اور وہ ہندوستان میں آنے والے اپنے مورث کے بارے میں خاموش رہتے یا صحیح جواب نہیں دیتے اور ان کے شجروں کی کڑیاں بھی آٹھ دس پشت سے زیادہ نہیں ملتیں، ان کے پاس اپنے دعویٰ کے ثبوت کے لیے کوئی معقول علمی دلیل نہیں ہے، شجرۂ نسب کے کسی حادثے میں تلف ہوجانے کا عذر کرتے ہیں، کسی دوسرے شہر میں بھی ان کے خاندان کی قدیم شاخوں کا پتہ نہیں ہے کہ ان سے کچھ سراغ مل سکے۔

قدیم خاندانوں میں جن کا پھیلاؤ کافی ہے ان کے کئی کئی نسب نامے پائے جاتے ہیں اور ان کی مختلف شاخوں کے پاس عہد بہ عہد مجموعی اور انفرادی دونوں طرح کے شجرے موجود ہیں، انفرادی شجروں میں بھی دیگر شاخوں کے ایسے اشارے پائے جاتے ہیں جن سے ایک دوسرے کی تصدیق و تائید ہوتی ہے، اگر بالفرض کسی کے پاس نسب نامہ نہیں ہے یا تلف ہوگیا ہے تو دوسری شاخوں کے نسب نامے سے ان کی معلومات فراہم ہوجاتی ہیں۔

ان مختصر خاندانوں میں اکثر لوگ ہندوستان ہی کی کسی دوسری جگہ سے آنے کا دعویٰ کرتے ہیں جیسے دہلی، دکن اور فیض آباد وغیرہ سے، ظاہر ہے دہلی اور دکن سے آنا کسی نسب کی صحت کی دلیل نہیں ہے، جب تک کہ علم انساب کے اصول کے مطابق ثبوت اور قراین نہ ہوں کسی نسب کا اثبات نہیں ہوسکتا، اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مندرجہ ذیل ممکن الوجود قراین میں سے اکثر کا پایا جانا نسبی صحت کے لیے ضروری ہے:

۱- قدیم ترین شجرۂ نسب ہو یا اس کی نقلیں اور حوالے دیگر شاخوں میں متداول ہوں۔

۲- نسب مشہور و متواتر ہو۔

۳- دستاویزوں اور اسناد کے نسبی اشارات بڑے اہم ہوتے ہیں۔

۴- بیاضوں اور تذکروں میں کسی فردِ خاندان کا تذکرہ۔

۵- خاندانی آثار کسی قابلِ ذکر عمارت کی تعمیر یا کسی کتاب کی تالیف، بزرگوں کے مزارات و مقابر۔

۶- زمانے کے اعتبار سے خاندان کا پھیلاؤ۔

۷- ذی علم اور ذی حیثیت لوگوں کا وجود، مثلاً بزرگ یا عالم دین یا امیر یا دیگر سرکاری ملازم وغیرہ۔

۸- مذکورہ تمام قرینوں کی اصلِ روح قدامت ہے، اس کی آخری حد ۱۸۵۷ء کو مقرر کیا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

کہ شاہین شہِ لولاک ہے تو

از جناب محمد بدیع الزماں صاحب☆

اس مضمون کا عنوان "بال جبریل" کی درج ذیل رباعی کا ایک مصرعہ ہے جس میں "لولاک" موضوعِ گفتگو ہے:۔

ترا جوہر ہے نوری ، پاک ہے تو — فروغِ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حور — کہ شاہین شہِ لولاک ہے تو

"لولاک" کی اصطلاح سے اقبال کی مراد ذاتِ محمدیؐ ہے ، یہ اصطلاح درج ذیل حدیث سے ماخوذ ہے، فرمایا رسول اللہؐ نے کہ فرمایا خدائے تعالیٰ نے کہ:۔

لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْأَفْلَاكَ

(اگر تو نہ ہوتا تو میں کائنات کو پیدا نہ کرتا)

مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کارخانۂ عالم کو حضور اقدسؐ کے تصدق میں پیدا کیا ہے، "لولاک" کی اصطلاح سے اقبال کے کلام میں کل تین اشعار ہیں جن میں ایک شعر اوپر رباعی میں ہے، باقی دو درج ذیل ہیں:۔

قصۂ قسطنطنیہ ، یعنی قیصر کا دیار — مہدیٔ امت کی سطوت کا نشانِ پایدار
صورتِ خاکِ حرم یہ سرزمیں بھی پاک ہے — آستانِ مسند آرائے شہِ لولاکؐ ہے
نکہتِ گل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہوا — تربتِ ایوب انصاریؓ سے آتی ہے صدا
اے مسلماں! ملتِ اسلام کا دل ہے یہ شہر — سینکڑوں صدیوں کی کشت وخوں کا حاصل ہے یہ شہر

("بانگ درا"۔"بلاد اسلامیہ"۔چوتھا بند)

☆ سابق ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ، ہارون نگر، فرسٹ سیکٹر، پھلواری شریف ، پٹنہ۔

جہاں تمام ہے میراث مردِ مومن کی — میرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک

("بال جبریل"۔غزل ۴۶)

"لولاک" کی اصطلاح سے پہلے شعر میں جو اس مضمون کا عنوان ہے ، اقبال مسلمانوں کو یہ نکتہ ذہن نشیں کراتے ہیں کہ تو اپنے آپ کو عناصر اربعہ کے امتزاج کا نتیجہ مت سمجھ، بیشک تیرا جسم مادی ہے لیکن تیرا جوہر تو نوری ہے اور وہ کثافت مادی سے بالکل پاک ہے، تو اشرف المخلوقات اور نائب خدا ہے، فرشتے اور دوسری نوری مخلوقات سب تیرے خادم ہیں، بلکہ تو اگر کوشش کرے تو تو ان کو صرف مسخر ہی نہیں کرسکتا بلکہ انہیں اپنا تابع فرمان بنا سکتا ہے، کیوں کہ تو سرکار دو عالمؐ کا غلام اور دست پروردہ اور فیض یافتہ ہے۔

اقبال اس سلسلہ میں "شاہین" کی مثال لاکر یہ بات بھی ذہن نشیں کراتے ہیں کہ جب ناقص انسانوں کا تربیت یافتہ شاہین بڑے بڑے پرندوں کا شکار کرسکتا ہے تو جس انسان کی تربیت حضورؐ خود فرمائیں، اگر وہ فرشتوں اور حوروں کا شکار کرے تو تعجب کی کوئی بات نہیں۔

اقبال کے کلام میں "شاہین" ایک اصطلاح ہے جس سے کلام میں کئی اشعار ہیں بلکہ "بال جبریل" میں ایک خصوصی نظم "شاہین" ہے، اقبال کو اس پرندے میں "مردمومن" کی بہت سی صفات نظر آتی ہیں جنہیں انہوں نے اس نظم میں تفصیل سے بیان فرمایا ہے اور نظم کے آخر میں اسے "پرندوں کی دنیا کا درویش" کے لقب سے نوازا ہے، اقبال نے "شاہین" سے ایک اصطلاح "شاہینی" بھی وضع کی ہے جس سے ان کی مراد "شاہین" کی سارے صفات سے متصف ہونا ہے، اس اصطلاح سے کلام میں صرف ایک ہی شعر ہے جو آگے آرہا ہے اور جس سے مراد حکمرانی ہے۔

"لولاک" سے تربیت دیے گئے باقی دو اشعار میں پہلا شعر "بانگ درا" کی نظم "بلاد اسلامیہ" کے چوتھے بند کا ہے، جس بند کو اقبال نے "قصۂ قسطنطنیہ" سے شروع کیا ہے، جس میں ایک طویل داستان ہے، اس شہر پر ۶۰۰ ق م میں یونانیوں نے قبضہ کرلیا اور اس کا نام Byzantium رکھا، مگر جب رومیوں نے ۱۴۶ ق م میں اس پر قبضہ کرلیا تو اس وقت کے قیصر روم Constantine نے اس شہر کا نام Constantinople کردیا، مسلمانوں نے اس شہر کو قبضہ کرنے کے لیے صدیوں جنگ

کی، مسلمانوں کا پہلا حملہ ۶۷۰ء میں ہوا تھا اور آخری حملہ ۱۴۵۳ء میں ہوا جب مسلمانوں نے اسے فتح کرلیا اور یہ شہر سلطنت عثمانیہ ترکیہ کا دارالخلافہ ۱۴۵۳ء سے پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴۔ ۱۹۱۸ء) کے خاتمہ تک رہا، جس جنگ میں سلطنت عثمانیہ ترکیہ کی پوری سلطنت پر مغربی سامراجیوں نے جن میں برطانیہ اور فرانس پیش پیش تھے، قبضہ کرلیا حتیٰ کہ ترکی پر بھی قبضہ کرلیا جہاں یہ شہر قسطنطنیہ واقع تھا، مگر ترکی فوج کے ایک افسر غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے اپنی شکست خوردہ فوج کی ٹکڑیوں کو جمع کر کے کم از کم ترکی کو بچانے کے لیے ان سامراجیوں کے خلاف جنگ کی اور انہیں شکست دی اور ۱۹۲۳ء کے معاہدۂ لوزاں کے تحت ان سامراجیوں نے جن میں اس وقت صرف برطانیہ اور یونان پیش پیش تھے، ترکی کی موجودہ سرحدوں کو تسلیم کرلیا، اسی سال غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے ترکی میں خلافت، جس کا سلسلے حضرت ابوبکرؓ کے وقت سے چلا آرہا تھا، ختم کردی اور ترکی کو جمہوریہ اعلان کردیا اور خود اس ملک سے ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۸ء میں اپنے انتقال تک صدر رہے اور اپنے دورِ اقتدار میں قسطنطنیہ کا نام بدل کر استنبول کردیا جو آج تک ترکی کا دارالخلافہ ہے۔

اقبال اسی لیے اس شہر کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اسے صرف ''مہدیٔ امت کی سطوت کا نشانِ پایدار'' ہی نہیں کہتے بلکہ ''آستانِ مسند آرائے شہِ لولاکؐ'' سے تعبیر کرتے ہیں، چونکہ مسلمان کم و بیش آٹھ سو سال تک اس شہر کو قبضہ کرنے کی کوشش کرتے رہے اور آخرش ۱۴۵۳ء میں فتح پائی، اس لیے اقبال اس بند میں یہ دادِ تحسین بھی پیش کرتے ہیں ؎

سینکڑوں صدیوں کی کشت و خوں کا حاصل ہے یہ شہر

اقبال کو اس شہر کی ہوا گلاب کی خوشبو کی طرح پاکیزہ محسوس ہوئی کیوں کہ اس شہر میں مشہور صحابی حضرت ایوب انصاریؓ کا مدفن ہے۔

''لولاک'' سے دوسرے یعنی آخری شعر پر، جو ''بال جبریل'' کی ایک رباعی کا ہے، اس مضمون کے آخر میں ''صاحبِ لولاک'' سے ترتیب دیے گئے شعر کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، چوں کہ دونوں اشعار کا پہلا مصرعہ ہم معنی ہیں۔

اقبال نے ''لولاک'' سے ایک اصطلاح ''لولاکی'' بھی وضع کی ہے جس سے کلام میں ایک ہی شعر ''بال جبریل'' کی درج ذیل رباعی میں ہے:۔

ترا اندیشہ افلاکی نہیں ہے تری پرواز لولاکی نہیں ہے
یہ مانا اصل شاہینی ہے تیری تری آنکھوں میں بے باکی نہیں ہے

اس رباعی میں ''اندیشہ''، ''افلاکی''، ''پرواز''، ''لولاکی''، ''شاہینی'' اور ''بیباکی'' الفاظ سے مشتق اصطلاحیں ہیں اور جب تک ان اصطلاحات کے معنیٔ پنہاں گرفت میں نہ لایا جائے، اردو زبان کے اوسط درجہ کے قاری کے لیے اس رباعی کو گرفت میں لانا مشکل ہے۔

''اندیشہ'' فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی فکر یا سوچ کے ہیں، اس سے اقبال کے کلام میں کل تین اشعار ہیں، دو اشعار ''بال جبریل'' کی دو رباعیوں میں ہیں جن میں ایک شعر متذکرہ بالا رباعی میں ہے اور تیسرا شعر ''ضرب کلیم'' کی نظم ''مدنیتِ اسلام'' میں ہے، تینوں اشعار میں اس سے مراد فکر اور سوچ ہے۔

اقبال کے کلام میں ''افلاک'' اور ''افلاکی'' دونوں الفاظ سے مشتق اصطلاحیں ہیں جن میں موخر الذکر سے مراد وہ مسلمان ہے جس کے طرزِ فکر و عمل میں اسلام کو سربلند کرنے کی حوصلگی ہو، جو اونچے عزایم رکھتا ہو، جس میں جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ موجزن ہو اور جو تسخیرِ کائنات کا فریضہ انجام دینے کا اہل ہو، کیوں کہ یہی تخلیقِ آدم اور تخلیقِ کائنات کا مقصد ہے، اس ''عزمِ بلند'' پر ''بال جبریل'' کی غزل ۲۲ میں یہ شعر ہے ؎

برہنہ سر ہے تو عزمِ بلند پیدا کر یہاں فقط سرِ شاہیں کے واسطے ہے کلاہ

اقبال کے کلام میں ''افلاکی''، ''خاکی'' کی ضد ہے، ''کلیاتِ اقبال'' میں ''خاک'' اور ''خاکی'' دونوں الفاظ سے مشتق الگ الگ اصطلاحیں ہیں جن دونوں سے کئی اشعار ہیں، ''خاکی'' یا ''جذبِ خاک'' سے اقبال کی مراد وہ شخص ہے جس کا طرزِ فکر و عمل مادیت پرستانہ ہو اور جس کا مقصدِ حیات صرف دنیا حاصل کرنا ہو ''افلاکی'' اور ''خاکی'' کے اس تضاد پر اس رباعی میں یہ مصرعہ ہے ''ترا اندیشہ افلاکی نہیں ہے'' یعنی خاکی ہے۔

ایسے انسان کو جس کا طرزِ حیات مادہ پرستانہ ہے، اقبال ''محکوم'' سے بھی تعبیر کرتے ہیں اور اس کے برعکس ''آزاد'' یا ''بندۂ آزاد'' جو اقبال کے نزدیک مردِ مومن کے مترادف ہیں، دونوں کے طرزِ فکر کا تقابلی جایزہ ''ارمغانِ حجاز'' کی نظم ''ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض'' کے دسویں

بند کے درج ذیل شعر میں ''افلاک'' کی اصطلاح لاکر اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہمدوش ‏ وہ بندۂ افلاک ہے، یہ خواجۂ افلاک

''خاکی'' کی اصطلاح اقبال نے درج ذیل آیات سے اخذ کی ہے:۔

''اور اے نبیؐ ان کے سامنے اس شخص کا حال بیان کرو جس کو ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا تھا مگر وہ ان کی پابندی سے نکل بھاگا، آخر کار شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا، یہاں تک کہ وہ بھٹکنے والوں میں شامل ہو کر رہا، اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیتوں کے ذریعہ سے بلندی عطا کرتے مگر وہ تو زمین ہی کی طرف رہ گیا اور اپنی خواہش نفس کے پیچھے پڑا رہا، لہذا اس کی حالت کتے کی سی ہوگئی کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے رہے اور اسے چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکائے رہے، یہی مثال ہے ان لوگوں کی جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں، تم یہ حکایات ان کو سناتے رہو، شاید یہ کچھ غور و فکر کریں'' (الاعراف :۱۷۵-۱۷۶)۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

''اے لوگوں جو ایمان لائے ہو، تمہیں کیا ہوگیا کہ جب تم سے اللہ کی راہ میں نکلنے کو کہا گیا تو تم زمین سے چمٹ کر رہ گئے؟ کیا تم نے آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی کو پسند کرلیا؟ ایسا ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ دنیوی زندگی کا یہ سب سروسامان آخرت میں تھوڑا نکلے گا'' (التوبہ:۳۸)۔

''پرواز'' بھی فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی تو اڑنا ہے مگر اقبال کے یہاں اس کے اصطلاحی معنی مادیت سے بے تعلق ہو کر روحانیت کی منزلیں طے کرنا ہے، چنانچہ اس کی تشریح ''بال جبریل'' کی نظم ''پرواز'' کے درج ذیل شعر میں ملتی ہے۔

جہاں میں لذت پرواز حق نہیں اس کا ‏ وجود جس کا نہیں جذب خاک سے آزاد

اقبال کے کلام میں اس اصطلاح سے ترتیب دیے گئے کل آٹھ اشعار انہی معنوں میں ہیں، متذکرہ بالا شعر کے علاوہ باقی سات اشعار میں پہلا ''بانگ درا'' کی نظم ''ایک مکالمہ'' میں ہے، دوسرا اور تیسرا شعر ''بال جبریل'' کی نظمیں ''آزادی افکار'' اور ''ساقی نامہ'' کے پانچویں بند میں ہے اور باقی چار اشعار ''ضرب کلیم'' کی نظمیں ''معراج''، ''اسرار پیدا''، ''صبح چمن''، اور ''محراب گل افغان کے افکار'' کے آٹھویں بند میں ہیں۔

''لولاکی'' کی اصطلاح سے مراد رسول اللہؐ کے ''اسوۂ حسنہ'' کی پیروی ہے، فرمایا گیا ہے:۔

''درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ ہے، ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے'' (الاحزاب:۲۱)۔

اب ''اندیشہ''، ''افلاکی''، ''خاکی''، ''پرواز'' اور ''لولاکی'' کی اصطلاحیں گرفت میں آچکنے پر زیر تجزیہ رباعی کے پہلے شعر کو قرآنی آیات کے ساتھ پڑھیں تو اس رباعی کا پہلا شعر پوری گرفت میں آجاتا ہے۔

اس رباعی کی دوسری نظمیں ''شاہینی'' اور ''بیباکی'' بھی الفاظ سے مشتق اصطلاحیں ہیں ''شاہینی'' کی اصطلاح پر اس مضمون میں اس سے قبل روشنی ڈالی جاچکی ہے، جس سے مراد حکمرانی ہے، اقبال کے کلام میں ''بیباک'' اور ''بیباکی'' دونوں الفاظ سے مشتق اصطلاحیں ہیں جو مرد مومن کی صفات میں شامل ہیں اور جو صرف شان فقر کی بہ دولت پیدا ہوتی ہیں جیسے ''بانگ درا'' کی نظم ''سید کی لوح تربت'' کے تیسرے بند کا یہ شعر:۔

بندۂ مومن کا دل بیم وریا سے پاک ہے ‏ قوت فرماں رواکے سامنے بیباک ہے

''بیباکی'' سے زیر تجزیہ رباعی کے شعر کے علاوہ ''بال جبریل'' کی غزلیات ۱۸ اور ۳۵ میں بھی اصطلاح ان ہی معنوں میں آتی ہے، جن میں پہلے شعر ''بیباک'' اور ''بیباکی'' دونوں اصطلاحیں آتی ہیں، دونوں اشعار علی الترتیب درج ذیل ہیں:۔

رمزیں ہیں محبت کی گستاخی و بیباکی ‏ ہر شوق نہیں گستاخ، ہر جذب نہیں بیباک

آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی ‏ اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اب ان ساری اصطلاحوں کو گرفت میں لاچکنے پر ہم زیر تجزیہ رباعی پر نظر ڈالیں جس میں اقبال نے اپنے عہد کے مسلمانوں کی موجودہ حالت زار پر تبصرہ کیا ہے وہ اس رباعی میں مسلمانوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ یہ بات تو درست ہے کہ تیری اصل شاہینی ہے یعنی اللہ نے تجھے حکمرانی کے لیے پیدا کیا ہے لیکن تو اپنی حقیقت سے بیگانہ ہوگیا ہے اور اپنی ساری صفات بھی ضائع کردی ہیں، نتیجتاً نہ تیرے اندر ترقی کا جذبہ پایا جاتا ہے اور نہ تجھ میں تسخیر کائنات کے حوصلے ہی نظر آتے ہیں، نہ تو تیرے اندر سرفروشی کا مادہ باقی ہے اور نہ اعلائے کلمۃ اللہ کا ولولہ ہی کارفرما ہے، بالفاظ دیگر تجھ میں نہ

جہاد کا جذبہ ہے اور نہ رسول اللہؐ کے ایمان کا رنگ، روشن ضمیری یا روحانیت کی شان ہی باقی ہے، اس لیے کہ تیرا اندیشہ افلاکی نہیں بلکہ "خاکی" یعنی دنیوی ہے، یعنی تیرے لیے دنیوی جاہ وجلال اور دولت کا حصول ہی سب کچھ ہے۔

اقبال نے "لالوک" سے ایک اصطلاح "صاحب لولاک" بھی وضع کی ہے جس سے کلام میں صرف ایک ہی درج ذیل شعر "بال جبریل" کی غزل ۱۰ (دوم) کا ہے ؎

عالم ہے فقط مومن جاں باز کی میراث — مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

اسی معنی میں "بال جبریل" کی ایک رباعی کا شعر "لولاک" کی اصطلاح کے تحت شروع میں گزر چکا ہے۔

ان دونوں اشعار کے پہلے مصرعہ کی تشریح میں شارح اقبال نے غلطی کی ہے اور دونوں اشعار کے پہلے مصرعہ کو سورۃ الانبیاء کی آیت ۱۰۵ اور سورۃ الزمر کی آیات ۳۹ اور ۴۰ کا ترجمان بتایا ہے، چوں کہ ان آیات میں زمین کی وراثت کا ذکر آیا ہے، جس سے اللہ تعالیٰ کی مراد جنت ہے، جب کہ اقبال نے ان دونوں اشعار کو ایک میں "جہاں" اور دوسرے میں "عالم" سے شروع کیا ہے، جس سے مراد اس دنیا کی وراثت یعنی "نیابت الٰہی" ہے، "صاحب لولاک" سے اقبال ایسا انسان مراد لیتے ہیں، جس نے بہ مصداق سورۃ آل عمران، آیات ۳۱ اور ۳۲ رسول اللہؐ کی پیروی اختیار کر لی ہے اور اس پیروی میں فنافی الرسولؐ ہو گیا ہو۔

جب اقبال "بال جبریل" کی رباعی میں کہتے ہیں کہ "میرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ "لولاک"" تو وہ مسلمانوں کو اپنے سارے کلام میں رسول اللہؐ کی پیروی اختیار کرنے کی تلقین کی یاد دلاتے ہیں، اس لیے کہ مسلمان کی فلاح، دنیا اور آخرت دونوں میں اسی پیروی پر منحصر ہے، ارشاد باری ہے:۔

"(پس آج یہ رحمت ان لوگوں کا حصہ ہے) جو اس پیغمبر، نبی امی (ﷺ) کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر انہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے، وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے، لہذا جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی حمایت و نصرت کریں اور اس روشنی کی پیروی اختیار کریں جو اس کے ساتھ نازل کی گئی ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں" (الاعراف: ۱۵۷)۔

چھنولال دلگیر لکھنوی

از جناب اسرار الحق قریشی ☆

چھنولال دلگیر لکھنوی ایک مستند شاعر تھے، انہوں نے شاعری کی ابتدا غزل سے کی تھی، طربؔ تخلص تھا لیکن جذبات واحساسات کی مخصوص تبدیلی کی بنا پر غزل کے میدان سے نکل کر مرثیہ کے میدان میں اپنا سکہ جمایا اور اپنے وقت کے معروف مرثیہ گو کہلانے لگے، مصحفی لکھتے ہیں:۔

"چھنولال طربؔ تخلص ولد منشی رسوا رام قوم کائستھ سکسینہ، وطن بزرگانش شمس آباد و بعضے از بزرگانش چندے در شاہ جہاں آباد ہم استقامت داشتہ، خودش در لکھنؤ تولد شدہ وہم انجا نشو ونما یافتہ و بہ سن تمیز رسیدہ، چوں از عالم مکتب نشینی در صغر سن موزوں طبع داشت از ہفتہ وسالگی چیزے موزوں می کرد آں را از نظر نوازش حسین عرف مرزا خانی می گزارند حالا چوں کلامش از فیض صحبت بزرگان بپایۂ پختگی رسیدہ از استاد خود پائے کم نمی آرد، عمرش تخمیناً بست وسہ سالہ خواہد بود......" (۱)۔

مصحفی کے مذکورہ بالا بیان میں چھنولال کے مرثیہ گو ہونے کا کوئی ذکر نہیں ہے، انہوں نے ان کو غزل گو کی حیثیت سے طربؔ تخلص کے ساتھ پیش کیا ہے، لہذا یہ مسئلہ کہ وہ غزل سے مرثیہ کی طرف کب رجوع ہوئے، ایک تحقیق طلب امر ہے۔

"دلگیر لکھنوی میر انیس سے قبل لکھنؤ کے مشہور مرثیہ گو تھے، ان کا نام چھنولال تھا، ابتدا میں مرزا خانی نوازش سے مشورۂ سخن کرتے تھے، جب نوازش کانپور چلے گئے تو انہیں کے مشورے سے ناسخ کے شاگرد ہوئے، غزل میں طربؔ تخلص تھا، ۱۲۳۰ھ میں مسلمان ہو گئے تو غزل کہنا چھوڑ دیا اور اپنا دیوان موتی جھیل (لکھنؤ) میں غرق کر دیا، غالباً اسی کے بعد دلگیرؔ تخلص

(۱) مصحفی، ریاض الفصحا، ص ۱۳۔

☆ ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ۔

اختیار کر کے مرثیہ کی طرف خصوصی توجہ صرف کی....."(۱)

اس سے یہ مسئلہ کافی حد تک حل ہوگیا کہ دلگیر غزل ترک کر کے مرثیہ کی جانب کب متوجہ ہوئے، ان کی غزلوں کا دیوان نایاب ہے حالاں کہ اس وقت میدان غزل میں ان کا پایہ اتنا بلند ہو چکا تھا کیوں کہ بہ قول مصحفی ان کا کلام اپنے استاد کے ہم پلہ تھا۔

اوائل شباب میں بڑے آزاد منش اور رنگین مزاج تھے، چنانچہ اسی عالم میں اپنا مذہب ترک کر کے مسلمان ہوئے اور اپنا نام بدل کر غلام حسین رکھا، اس کے بعد غزل گوئی کے بہ جائے مرثیہ کہنے لگے، چوں کہ صاحب استعداد تھے اس لیے اس فن میں جلد شہرت حاصل کرلی، میر خلیق اور فصیح ان کے ہم عصر تھے (۲)۔

دلگیر کی ولادت لکھنؤ میں ہوئی، مصحفی نے ریاض الفصحا کی تالیف کے وقت ان کی عمر ۲۳ سال بتائی ہے، ڈاکٹر مسیح الزماں نے اسی حساب سے ان کی ولادت ۱۱۹۸ھ اور لالہ سری رام نے غالباً ۱۷۹۶ء لکھی ہے، غالباً کی احتیاط ملحوظ رکھتے ہوئے بھی کہنا پڑتا ہے کہ وہ آصف الدولہ کے آخری عہد یا سعادت علی خاں کے دور کے اوائل میں پیدا ہوئے تھے، مصحفی نے اپنے تذکرے میں ان کی عمر ۲۳ برس بتائی ہے یعنی دلگیر ۱۸۰۷ء میں ۲۳ برس کے رہے ہوں گے اور اسی وقت ان کا شمار صفِ اول کے غزل گو شعرا میں ہونے لگا تھا اور مصحفی کے بیان کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ اس وقت تک مرثیہ کہنے کی طرف آمادہ نہیں ہوئے تھے۔

چھنولال دلگیر پہلے غزل گو اور بعد میں مرثیہ گو کی حیثیت سے مقبول ہوئے، غازی الدین حیدر کے عہد میں ان کا نام بہ حیثیت ایک عظیم مرثیہ گو کے شمار ہوتا تھا، اس زمانے کی تفصیل مرزا احمد بیگ نے اس طرح پیش کی ہے:۔

"۱۲۵۵ھ میں امین آباد کے بازار کی تعریف میں مثنوی لکھ کر جناب محمد علی شاہ بادشاہ اودھ سے مبلغ چار سو روپے نقد اور خلعت انعام میں حاصل کیے، جناب نواب سعادت علی خاں نے بھی طرح طرح کی نوازشوں سے ممتاز کیا تھا برسوں ان کی سرکار سے وابستہ رہے، نواب صاحب کے بعد جناب غازی الدین حیدر صاحب نے ان کے اعزاز میں اضافہ کیا مگر منتظم الدولہ

(۱) ڈاکٹر سید سلیمان حسین صاحب، رسالہ آج کل ص ۱۹، اپریل ۱۹۶۶ء (۲) لالہ سری رام: خمخانۂ جاوید جلد سوم ص ۱۹۵

جناب نواب حکیم مہدی علی خاں کشمیری کی وزارت کے زمانے میں تمام نوازشات بند ہوگئیں اور جب محمد علی شاہ بادشاہ تخت نشین ہوئے تو انہوں نے اپنی پریشانیوں کی منظوم روداد عرض داشت کی شکل میں ارسال کی جس پر بادشاہ سلامت نے دو سو روپے کا عطیہ عنایت کیا، اس زمانے میں ان کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوا"(۱)۔

دلگیر لکھنوی کی ایک غیر مطبوعہ "مثنوی" کے عنوان سے، ڈاکٹر سید سلیمان حسین صاحب اپنے مضمون میں رقم طراز ہیں:۔

"دلگیر لکھنوی نے امین آباد لکھنؤ کی تعریف میں ایک مثنوی نظم کی تھی، اس کا واحد قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں "مثنوی طرب" کے نام سے محفوظ ہے، یہ مثنوی نواب امداد حسین خاں کے زمانۂ وزارت (۱۲۵۸ھ-۱۲۶۳ھ) کی تصنیف ہے اشعار کی تعداد ۱۴۴ ہے....."(۲)۔

ڈاکٹر سید سلیمان حسین صاحب نے اس قلمی نسخہ کی نقل اپنے مضمون میں پیش کی ہے، اس مثنوی میں حمد و نعت و منقبت کے بعد امجد علی شاہ اور امین الدولہ وزیر کی تعریف ہے، اس کے بعد امین آباد بازار کی تعریف ہے، ڈاکٹر صاحب کے مضمون کی اشاعت کو بہت عرصہ گزرا اس لیے ان کے مضمون سے چند اشعار نقل کر کے یہاں پیش کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

در مدح وزیر:

وزیر عصر ہے خیر مجسم   امین الدولہ دستورِ معظم
سخی و منصف و عالی ہمم ہے   خلیق و با مروت با کرم ہے
بدی ہرگز طبیعت میں نہیں ہے   غرور و عجب طینت میں نہیں ہے
بھلائی خلق کی دن رات کرنی   ہر ایک انسان سے ہنس کر بات کرنی
ہمیشہ دست ہمت ہے گہر بار   کہ نیساں چومتی ہے ہاتھ ہر بار
زبس فیض اس سے ہے خورد و کلاں کو   غرض سارا زمانہ ہے دعا گو
علی کا واسطہ اس دم دلا کر   تو اے دلگیر حق سے یوں دعا کر
ہمیشہ نیّر حشمت ہو تاباں   عدو جو ہو وہ ہو خوار و پشیماں

(۱) مرزا احمد بیگ: مرثیہ نگاران اردو، ص ۲۲۷ (۲) رسالہ آج کل بابت اپریل ۱۹۶۶ء، ص ۱۹، ۲۰۔

در مدح امین آباد :

امین آباد کی لکھتا ہوں تعریف   ہے بے شک وہ جگہ شایانِ توصیف
ثنائے او بہ عالم فرض عین است   بنائے آں ز امداد حسین است
جو دیکھیں خواب میں یوسف یہ بازار   تو جان و دل سے ہوں اس کے خریدار
نہ اس بازار کو بازار کہیے   اگر کہیے تو پھر گلزار کہیے
کہوں میں کیا دکانوں کے قرینے   نہ جلوے دیکھے یہ اب تک کسی نے
مہیا ہے دکانوں میں ہر اک شے   کوئی شے لطف سے خالی نہیں ہے
کوئی دیکھے جو صرافہ جہاں ہے   تو مملو سیم و زر سے ہر دکاں ہے
نہیں کھوٹے کا دخل اس جا ذرا ہے   جو اس بازار میں ہے سو کھرا ہے
ہیں اک جانب کو حلوائے مسلماں   بھری شیرینی سے ہر ایک دکاں
کہیں پر ہے دکانِ نان بائی   ہر ایک شے اس دکاں کی دل کو بھائی
جہاں سب پھول والوں کا ہے بازار   حقیقت میں عجب تختہ ہے گلزار
بساطی کی دکانیں اک طرف ہیں   ہزاروں مشتری واں زر بکف ہیں
جو کوچہ ہے وہ دولت سے بھرا ہے   وزیر ہند کی دولت سرا ہے
لکھو یہ آب زر سے قول میرا   جو اچھا ہوگا وہ ایسا ہی ہوگا
سنا کب دوسرا نواب سا ہے   سخاوت کا ائمہ کے پتہ ہے
جو ہے نواب کے آنے کا رستہ   شجاعت واں کھڑی ہے دست بستہ
یہی جب محمد کا ہے جلوہ   دلائے آل احمد کا ہے جلوہ
غلام اچھا وہی ہے بندہ پرور   کہ جو ہو ٹھیک آقا کے چلن پر
وزیر ایسا نہ دیکھا کوئی واللہ   نہ ان اوصاف و خوبی کا شہنشاہ
رضا جس امر میں ہے بادشاہ کی   اسی میں ہے خوشی اس باسخا کی
نہ اپنے جسم کا نہ جان کا ہے دھیان   ہر ایک دم راحت خاقاں کا ہے دھیان

خاتمہ بردعا ؂

دعا پر ختم کر دلگیر تو اب   دعا مقبول میری ہو یہ یا رب
الٰہی یہ شہنشاہ معظم   رہے با حشمت و اقبال ہر دم
وزیر عصر کا برتر ہو پایا   رہے چودہ تنوں کا اس پہ سایا
مرے نواب کا ہو جو کہ بد خواہ   وہ غارت ہووے جلد اے میرے اللہ

قطعہ ؂

تری درگاہ سے اے سب غفار   زیادہ اور کمی کا ہوں طلب گار
وزیر عصر کا افزوں حشم ہو   جو دشمن ان کا ہو دنیا سے کم ہو
ہمیشہ چاہتا ہوں یا الٰہی   میں اک جا روشنی اک جا سیاہی
وزیر عصر کا ہو نام روشن   سیہ رو ہو جہاں میں ان کا دشمن

آغا حسن امانت لکھنوی کا تخلص دلگیر کا تجویز کیا ہوا تھا، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی رقم طراز ہیں:۔

''اس وقت لکھنؤ کے مرثیہ گو شعرا میں میاں دلگیر کا بول بالا تھا، چنانچہ آغا حسن کے والد اس نوخیز شاعر کو ساتھ لے کر کہنہ مشق استاد کی خدمت میں حاضر ہوئے، آغا حسن نے اپنے سلام سنائے جن کو سن کر دلگیر بہت خوش ہوئے اور مستقبل کے متعلق امید افزا خیالات کا اظہار کیا اور امانت تخلص تجویز کیا......'' (۱)۔

پروفیسر اکبر حیدری کشمیری نے دلگیر کے حالات زندگی تفصیل سے اپنی کتاب منظومات میاں دلگیر میں بیان کیے ہیں، اپنی دوسری کتاب اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقا (ص ۴۶۶) پر لکھتے ہیں کہ راقم کی دریافت کے مطابق دلگیر کا سنِ پیدایش ۱۱۹۵ھ مطابق ۱۷۸۰ء ہے، کیوں کہ خود دلگیر کے قول کے مطابق ۱۲۵۵ھ/۱۸۴۱ء میں ان کی عمر ساٹھ سال تھی، اس کا ثبوت یہ ہے کہ ۱۲۵۵ھ میں دلگیر نے حسین آباد کے بازار کی تعریف میں ایک مثنوی لکھی جس کے آخر میں یہ تاریخ درج ہے ؂

لکھا یہ مصرعہ تاریخ یک بار   صفات شاہ میں ہے مدح بازار

دلگیر کے بیان کے مطابق محمد علی شاہ بادشاہ اس مثنوی پر بہت خوش ہوئے، انہوں نے

(۱) ابواللیث صدیقی، لکھنؤ کا دبستان شاعری، ص ۲۳۰۔

ازراہ قدردانی مبلغ چار سو روپے انعام کے علاوہ خلعت سے بھی ممتاز فرمایا، دلگیر کہتے ہیں ؎

ہوئی سارے جہاں میں میری عزت   کہ مبلغ چار سو اور خلعت
ملا یہ بعد عمر شصت سالہ   تصدق شہ کا رومال اور دوشالہ

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے پروفیسر اکبر حیدری کی حمایت میں ایک مضمون بہ عنوان "دلگیر مرثیہ گو کا مذہب اور ہندوؤں کا اسلامی نام" نیادور لکھنؤ بابت جولائی ۱۹۷۲ء میں لکھا، اس کے جواب میں کئی مضمون کالی داس گپتا رضا نے تحریر کیے جن کا ابھی تک کوئی تسلی بخش جواب نہیں ہوسکا، پروفیسر مسعود حسن رضوی کے مطابق نخاس میں جو بڑھی قبر چڑیا بازار میں ہے وہ دلگیر کی ہے، راقم الحروف نے جب وہاں جاکر خود دیکھا تو کہیں دلگیر کا نام کندہ نہیں پایا تاہم لوگوں نے بتایا کہ یہ قبر میاں دلگیر کی ہے۔

دلگیر کا انتقال ۱۲۶۴ھ میں ہوا، رشک لکھنوی نے تاریخ وفات کہی ؎

در گلشن خلد با جمیع شہدا   گشتہ پا بوس مرثیہ گو دلگیر
تاریخ وفات او نوشتم اے رشک   آہ آہ افسوس مرثیہ گو دلگیر
۱۲۶۴ھ

پروفیسر اکبر حیدری ڈاکٹر مسیح الزماں کے اس خیال سے متفق نہیں ہیں کہ مطبع نول کشور میں دلگیر کے مراثی کی سات جلدیں چھپی تھیں، وہ کہتے ہیں کہ جلد دوم کے آخر میں جلد ہفتم کا جو اعلان چھپا تھا وہ غلط ہے، موصوف اپنی کتاب منظومات میاں دلگیر صفحہ ۱۶۔ ۱۸ (مطبوعہ ۱۹۷۰ء) میں لکھتے ہیں کہ:۔

"جناب ابواللیث صدیقی (لکھنؤ کا دبستان شاعری صفحہ ۶۸۰ مطبوعہ دہلی ۱۹۶۵ء) اور ڈاکٹر مسیح الزماں صاحب (اردو مرثیے کا ارتقا، صفحہ ۳۷۹) نے مراثی دلگیر کی سات جلدوں کا ذکر کیا ہے علاوہ ازیں مراثی دلگیر جلد دوم کے آخری صفحہ کے اشتہار سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مطبع نول کشور لکھنؤ میں سات جلدیں شایع ہوئی تھیں، مجھے ان کی صرف چھ جلدیں دستیاب ہوئیں، ساتویں جلد انتہائی کوششوں کے باوجود کہیں دستیاب نہیں ہوئی، جناب مسعود حسن رضوی ادیب کے کتب خانے میں پہلی پانچ جلدیں، لکھنؤ یونیورسٹی ٹیگور لائبریری میں پہلی تین، امیر الدولہ پبلک لائبریری لکھنؤ اور راجہ محمود آباد صاحب کے کتب خانے میں جلد اول سے

جلد ششم تک دستیاب ہیں"۔

راقم الحروف کو چھنولال دلگیر کے مراثی کے مجموعے تین جلدوں میں دستیاب ہوئے ہیں، یہ لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ ٹیگور لائبریری کے کیٹلاگ نمبر (U-891.4316-D44m) پر محفوظ ہیں، ان کی تفصیلات حسب ذیل ہیں۔

منشی چھنولال دلگیر لکھنوی کے مراثی موسوم بہ "مجموعۂ مراثی مرزا دلگیر" جلد اول ۱۸۸۸ء مطابق ماہ صفر المظفر ۱۳۰۶ھ مطبع منشی نول کشور لکھنؤ سے چھپا اس میں ۵۰۳ صفحات ہیں، دوسری جگہ منشی پراگ نراین بھارگو صاحب کی زیر سرپرستی مطبع منشی نول کشور واقع کانپور مئی ۱۸۹۷ء بار اول چھپا، یہ مراثی مجموعہ ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ہے، جلد سوم بھی موصوف کی فرمایش پر مئی ۱۸۹۷ء میں پہلی مرتبہ چھپی، اس میں ۴۹۶ صفحات ہیں، ان جلدوں کے سایز 26x171/2 ہیں، سید امجد حسین صاحب اپنی کتاب غیر مسلم مرثیہ نگار میں تمام جلدوں کی تفصیل اس طرح پیش کرتے ہیں:۔

جلد	تعداد صفحات	فی صفحہ تعداد بند	سن طباعت
اول	۵۰۳	۹	اکتوبر ۱۸۸۸ء
دوم	۵۰۰	۹	۱۸۹۷ء
سوم	۴۹۶	۹	مئی ۱۸۹۷ء
چہارم	۵۰۳	۹	دسمبر ۱۸۸۵ء
پنجم	۵۰۳	۹	اگست ۱۸۸۶ء
ششم	۲۳۲	۹	دسمبر ۱۸۸۶ء

جلد اول کے خاتمہ کی عبارت یہ ہے:۔

"کلام بلاغت نظام قدوۃ الشعراء...... جناب منشی دلگیر، مطبع اودھ اخبار کو دستیاب ہوا، پانچ جلدوں پر تقسیم کیا گیا...... بار دوم مطبع جناب نول کشور واقع لکھنؤ، محلہ حضرت گنج بہ ماہ اکتوبر ۱۸۸۸ء مطابق ماہ صفر المظفر ۱۳۰۶ھ میں حلیۂ طبع سے آراستہ ہوکر حمائل گلوے مشتاقان ہوئی"۔

یہ جلد مجموعۂ مرثیہ دلگیر اور کلیات مرثیہ دلگیر یعنی دو نام سے چھپی ہے، صفر اول سے

۲۷۶ تک سلام اور ایک مخمس در منقبت حضرت علی ہے، پھر ۲۷۷ سے ۵۰۳ تک مراثی ہیں، جلد دوم کے خاتمہ میں مرقوم ہیں:۔

جلد دوم کلیات مرثیہ دلگیر بھی تمام ہوئی...... علاوہ اس جلد دوم کے حصہ اول و جلد دوم لغایت جلد ہفتم طبع شدہ مطبع میں موجود ہیں ...... یعنی ساتویں جلد طبع شدہ موجود تھی اب اگر دستیاب نہیں تو اس کے معنی ہیں کہ طبع نہیں ہوئی (پروفیسر اکبر حیدری کاشمیری)۔

جلد پنجم کا خاتمہ:۔

کلام بلاغت نظام...... جناب منشی دلگیر...... مطبع اودھ کو دستیاب ہوا، چھ جلدوں پر تقسیم کیا گیا، جلد اول، دوم، سوم، چہارم، پنجم تیار ہوئی، جلد ششم زیر طبع ہے، جلد اول میں رباعیات، سلام و خمسہ، مسدس و مرثیہ ہیں اور باقی جلدوں میں ہر حال کے مرثیے ہیں۔

جلد ششم کے خاتمہ کی عبارت یہ ہے:۔

''جلد ششم مجموعۂ مرثیہ...... جناب مرحوم منشی دلگیر...... مطبع نول کشور بماہ دسمبر ۱۸۸۶ء مطابق ماہ ربیع الاول ۱۳۰۴ھ طبع ہو کر ہدیہ ناظرین ہوئی......''۔

مذکورہ بالا تفصیلات امجد حسین صاحب کی کتاب غیر مسلم مرثیہ نگار سے لی گئیں ہیں جس میں پروفیسر اکبر حیدری نے دلگیر کے مرثیوں کا اشاریہ بھی مرتب کیا ہے، بہ قول ان کے دلگیر کے اشعار کی تعداد ایک لاکھ کے قریب ہے، ان کے مرثیوں میں بندوں کی تعداد ۵۷ سے ۱۶۷ تک ہے، انہوں نے تمام جلدوں سے مطلع بھی دیے ہیں، بہر حال اکبر حیدری صاحب نے دلگیر پر خاصہ کام کیا ہے، نمونۂ کلام:۔

معطر اس کے نہانے سے بسکہ آب ہوا
حباب بحر ہر اک شیشۂ گلاب ہوا

کام اپنا خیالِ رخِ جاناں سے نکالا
کارِ شبِ عشرت شبِ ہجراں سے نکالا

یہ ساری پریشانیاں کیں ہم نے گوارا
لیکن نہ دل اس زلفِ پریشاں سے نکالا

ہم سہہ نہ سکے طعنۂ ابنائے زمانہ
غیرت نے ہمیں محفلِ یاراں سے نکالا

یہ طالب ایذا ہیں کہ جو پاس لگا خار
ہم نے جو نکالا اسے پیکاں سے نکالا

دل کو شبِ الفت میں طرب آپ ڈبایا
دانستہ اسے ہم نے نہ طوفاں سے نکالا

کس کو دکھاؤں میں یہ بھلا ماجرائے چشم
ناسور پڑ گئے ہیں عزیز و بجائے چشم

ان دونوں پہ ہے عشق میں اک حادثہ پڑا
روتی ہے چشم بہر دل و دل برائے چشم

مجھ کو کسی سے خلق میں چشم وفا نہیں
روتا نہ میرے حال پہ کوئی سوائے چشم

باتیں تیری سنا کریں اور دیکھیں تیری شکل
وہ مدعائے گوش ہے یہ مدعائے چشم

آئے طربؔ جو تیرا وہ خوش چشم باغ میں
نرگس کے دستے کیجیو تو بھی فدائے چشم

سدا شبنم کو اپنی چشم تر پر رشک آتا ہے
گلِ تر کو گل زخم جگر پر رشک آتا ہے

ہماری آہ نے ایسا اثر پیدا کیا ہے اب
دعائے خلق کو جس کے اثر پر رشک آتا ہے

قدم بوسی جاناں ہر گھڑی اس کو میسر ہے
مرے ہونٹوں کو اس کے سنگ در پر رشک آتا ہے

نہ جس کو دیں کی کچھ خواہش ہے نہ کچھ کام دنیا سے
طربؔ ہم کو بس ایسے ہی بشر پر رشک آتا ہے

غزل:

کام دل پہ منت جلاد حاصل ہوگیا
واں ہلی ابرو ادھر یہ آپ بسمل ہوگیا

قیس کا یہ حال تھا صحرا میں فرطِ شوق سے
جو اٹھے گرد اشتباہ گرد محمل ہوگیا

خوبیِ قسمت تو دیکھو جب وہ آیا بے نقاب
پردۂ شرم و ادب آنکھوں کا حایل ہوگیا

اس قدر آنکھوں میں اپنی کھب گئے تصویر یار
اس کا خالِ رخ ہمارے چشم کا تل ہوگیا

بعد مردن یہی رہی سر میں مرے جوئے سوال
کاسۂ سر کاسۂ حاجات سایل ہوگیا

موجب تضحیک عالم پہلے تھا عشقِ طربؔ
یار کی الطافینی فیتی آخر کو کامل ہوگیا

مرگ آئے کیوں جو حیف میرے دل میں رہ گیا
خنجر کھنچا ہوا کفِ قاتل میں رہ گیا

پٹ نہ کھولی آنکھ سے ہنگامِ ذبح بھی
ارمان دید کا دل بسمل میں رہ گیا

قاصد یہ کہیو کچھ نہیں باقی شتاب آ
باقی نفس ہی اب تیری مایل میں رہ گیا

زاہد کو سنگِ کعبہ عزیز اور مجھ کو دیر
اتنا ہی فرق عاقل و جاہل میں رہ گیا

ہم اے طربؔ جہاں سے حسرت بھرے چلے
جو صرف مدعا تھا سو وہ دل میں رہ گیا

طربؔ کی مذکورہ غزلیں بنارس ہندو یونیورسٹی میں محفوظ مخطوطہ سے لی گئیں، اس مخطوطہ کا عکس محترم پروفیسر سید حنیف نقوی صاحب نے بذریعہ ڈاک مورخہ ۰۳/۶/۱۳ کو ارسال کیا،

جس کی چند غزلیں پیش کی جارہی ہیں بقیہ راقم الحروف کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔

مرثیہ کے چند بند ملاحظہ ہوں:۔

جب آیا امیروں کے لیے حکم رہائی
زینب نے خبر قید سے چھٹنے کی جو پائی
کہنے لگی حضرت نے بہت دیر لگائی
چھٹنے کا جو وقت آیا مگر آئے نہ بھائی
بے سبط نبیؐ لطف رہائی نہیں لوگو
زنداں سے نہ نکلوں گی کہ بھائی نہیں لوگو

جس دم نہ سر پہ میرے سایۂ سرورؐ
پھر مجھ کو اسیری و رہائی ہے برابر
اکبر ہے نہ قاسم ہے نہ عباسِ دلاور
یہ میری رہائی تو ہے اب قید سے بدتر
سر پیاروں کے کٹوا کے چھٹی قید سے تو کیا
بن بھائی کے کہلا کے چھٹی قید سے تو کیا

اے صاحبو تم سب کو مبارک ہو رہائی
جاؤں گی میں یاں سے نہ آئے میرے بھائی
جب ہو چکی ماں جائے سے درپیش جدائی
پھر قید سے بھی مخلصی پائی کہ نہ پائی
نکلی تھی مدینہ سے بہن بھائی کے ہم راہ
اب بھائی کہاں جائے جو ماں جائی کے ہم راہ

سجاد نے جس دم یہ سنا اپنی پھوپھی سے
رورو کے وہ کہنے لگے اس بنتِ علی سے
ایسا ہی تمہیں عشق تھا فرزندِ نبیؐ سے
قربان ہو تم نام پہ شبیر کی جی سے
یاں چھوڑ کے جاؤں میں تمہیں یہ نہ کہو تم
مل جائے جو یاں رہنے سے بھائی تو رہو تم

عابد سے باتیں ابھی کرتی تھی وہ دلگیر
جو اہل جفا آگئے کرنے لگے تقریر
مجلس میں بلانا ہے تمہیں حاکم بے پیر
اب چھٹتی ہو تم بھی اے صاحب توقیر
زنداں مصیبت میں نہ ہاتھوں کو ملو تم
رخصت وہ کرے سامنے حاکم کے چلو تم

’’حضرت امام حسینؑ مع رفقا و اعزا اور مخدرات عصمت و طہارت مدینہ چھوڑ رہے ہیں، حضرت فاطمہ صغریٰ کو بیماری کی وجہ سے مدینہ ہی میں رہنے دیتے ہیں، سفر کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں، تمام بیویاں محلوں میں بیٹھ چکی ہیں، جناب فاطمہ صغریٰ کو بے حد افسوس ہوتا ہے کہ بابا جان سب کو اپنے ساتھ لے جارہے ہیں لیکن مجھے یہاں چھوڑے جاتے ہیں، وہ اپنی چھوٹی بہن حضرت سکینہ سے دریافت کرتی ہیں کہ میرا نام بھی جانے والوں میں ہے یا نہیں، فاطمہ اور حضرت سکینہ کی گفتگو دلگیر کی زبانی سنیے، اس میں جذبات و واقعات کی کتنی حسین عکاسی کی گئی ہے‘‘۔

کہنے لگی سکینہ سے یہ صغریٰ پکار کر
اٹھ کر پدر کے زانو سے آؤ ذرا ادھر
بیمار کو بھلا دیا کیوں تم نے اس قدر
یہ آج کیا ہے تم جو ملاتیں نہیں نظر
تم نے سفر سے پہلے ہی توڑی کمر مری
کیوں آج صبح آ کے نہ پوچھی خبر مری

آئی سکینہ پاس تو صغرا نے یہ کہا
بیٹھے بٹھائے بہنا یہ کیسا سفر ہوا
جاتے ہیں کس طرف کو پدر ماجرا ہے کیا
بابا نے میرا نام لکھا یا نہیں لکھا
کس کس کی ہم رہی پہ رضائے امام ہے
اس بند میں لکھا ہوا کس کس کا نام ہے

بہنا بتاؤ ذکر مرا بھی سنا ہے کچھ
میرے بھی حق میں بابا نے منھ سے کہا ہے کچھ
چلنا نہ چلنا میرا بھی ثابت ہوا ہے کچھ
پوشیدہ ہے یہ راز کہ تم پر کھلا ہے کچھ
کیسا ہے یہ سفر ہے پھوپھی جان روتی ہیں
یہ کیا سبب ہے باتیں جو کانوں میں ہوتی ہیں (۱)

دلگیر کے بعد کا دور انیس و دبیر کا ہے، مرزا دبیر کے ایک اور ہندو شاگرد رام پرشاد بشیر کے مرثیے بہت مقبول ہوئے، یہ حقیقت ہے کہ انیس و دبیر نے مرثیہ کو وسعت افلاک اور رفعت ثریا عطا کی لیکن اس سے بھی قطعی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دلگیر نے ہر لحاظ سے مرثیہ میں جدت پیدا کی ہے، ان کے مراثی کی ضخیم جلدوں کا مطالعہ کیا جائے اور غائر نظر سے ان کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تو بلاشبہ دلگیر کا قد اونچا نظر آئے گا۔

(۱) پروفیسر شیث محمد اسماعیل، دراسات اسلامیہ کے فروغ میں ہندوؤں کی خدمات، ص ۲۷۵، ۲۷۶۔

استدراک

از پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی ☆

• معارف کے اگست ۲۰۰۳ء کے شمارے میں مولانا وارث ریاضی کا جو مضمون میرے حوالے سے شایع ہوا ہے اس کے بارے میں چند باتیں عرض کرنی ہیں:۔

جیسا کہ وارث ریاضی صاحب نے لکھا ہے ڈاکٹر صفات علوی کا جو مضمون کاروانِ ادب (بھوپال) کے شمارہ نمبر ۷ میں شایع ہوا تھا، اس میں انہوں نے دو سوال اٹھائے تھے، ہندوستان میں اسلام کا وہ تاثر کیوں نہیں ہوا جو بعض دوسرے ممالک میں ہوا اور ہندوستان آکر مسلمانوں نے وہ اصطلاحات کیوں قبول نہیں کیں جو بعض دوسرے ممالک مثلاً ایران میں قبول کیں، پہلے سوال کا جواب دینے کی خود علوی صاحب نے کوشش کی ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ ہندوستان کا تمدن اتنا قدیم اور مستحکم تھا کہ اس نے اسلام کا وہ اثر قبول نہیں کیا جو بعض دوسرے ممالک نے کیا تو یہ بات تو مصر کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے، پھر وہاں اسلام کا تاثر زیادہ قوی کیوں ہوا، اس کے جواب میں میں نے علامہ اقبالؔ کے وہ شعر نقل کیے تھے جن کا حوالہ وارث صاحب نے اپنے مضمون میں دیا ہے، اس سلسلے میں مجھے مزید یہ عرض کرنا ہے کہ اقبال نے اپنے اشعار میں ہندوستانی تمدن کی جس برتری کی طرف اشارہ کیا ہے اس کا راز اس کے تسلسل میں پنہاں ہے اگر ہم صرف فنِ تعمیر کو پیش نظر رکھ کر بات کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ اجنتا اور ایلورا، دہلی کی جامع مسجد، لال قلعہ اور تاج محل اور جدید دور میں پارلیمنٹ ہاؤس، راشٹرپتی بھون اور انڈیا گیٹ سب ہمارے تمدن کے روشن مینار ہیں، لیکن جیسا کہ میں نے کاروانِ ادب میں شایع شدہ اپنے مکتوب میں لکھا ہے، آج کوشش ہو رہی ہے کہ ہمارے تمدن کے اس تسلسل کو ختم کر کے صرف اجنتا اور ایلورا کے تمدن کو واپس لایا جائے، یہ کوشش علامہ اقبال کی بیان کردہ ہندوستانی تمدن کی برتری کے لیے سم قاتل ثابت ہوگی۔

دوسرے سوال کے بارے میں یہ میری سوچی سمجھی رائے ہے کہ جہاں اسلام عربوں کے ذریعہ پہنچا وہاں اس نے زیادہ گہرے نقش مرتسم کیے، خود ہندوستان میں جہاں تک محمد بن قاسم کے

☆ حبیب منزل، میرس روڈ، علی گڑھ

قدم پہنچے وہاں اسلام کا زیادہ گہرا اثر ہوا، وارث صاحب نے اپنے مضمون میں بالکل بجا لکھا ہے کہ بعض ایشیائی اور افریقی ممالک میں چوں کہ اسلام صحابۂ کرامؓ کے ذریعہ پہنچا تھا اس لیے وہاں اس نے زیادہ گہرے نقوش مرتسم کیے، ان کی یہ رائے میری رائے سے متعارض نہیں ہے بلکہ اسے تقویت پہنچاتی ہے، عربوں نے دوسروں پر اثرات مرتب بھی کیے اور ان کے اثرات قبول بھی کیے، فلپ حِٹی کے مطابق عربوں میں سیکھنے کا شدید جذبہ تھا، انہوں نے یونان سے فلسفہ اور طب سیکھی، ایران سے زبان اور ثقافت میں اثرات قبول کیے، ہندوستان سے ریاضی اور اقلیدس حاصل کی اور چین سے کاغذ اور شیشہ سازی اختیار کی اور پھر ان علوم وفنون کو ساری دنیا میں پھیلا دیا۔

اس بارے میں وارث صاحب نے میری جو گفتگو نقل کی ہے اس کا آخری جملہ غالباً صحیح نقل نہیں ہوا ہے، بھگوان کا لفظ ہرگز قابل قبول نہیں ہے کیوں کہ وہ تو انسانوں کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے، میں نے ایشور یا پرمیشور کہا ہوگا، یہ لفظ بھی یقیناً اللہ کا مفہوم ادا نہیں کرتے ہیں، لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، خدا (یا God) بھی اللہ سے مختلف مفہوم رکھتے ہیں، تاہم ہم انہیں بلاتردد بولتے اور لکھتے ہیں۔

اس سلسلے میں جو توجیہہ وارث صاحب نے اپنے پیش نظر مضمون میں کی ہے وہ میرے نزدیک اطمینان بخش نہیں ہے، اگر ہندوستان میں اللہ تعالیٰ کے لیے بے شمار نام مستعمل تھے تو ان میں سے بھی وہ نام اخذ کیا جاسکتا تھا جو اس کی کسی صفت کا مظہر ہوتا، جیسے خدا اختیار کیا گیا جو صفتِ حاکمیت کا مظہر ہے، اسی طرح اگر مسئلہ "تشخص کے بقا کے احساس" کا تھا تو یہ تشخص خورشید، جمشید، شہناز، مہ جبیں وغیرہ نام اختیار کرنے سے کیوں متاثر نہیں ہوا اور آنند، راجیو، اوشا، ارونا جیسے نام اختیار کرنے سے کیوں متاثر یا مجروح ہو جاتا، وارث صاحب اتنا طویل مضمون لکھنے کے باوجود ان سوالوں کا شافی جواب نہیں دے سکے ہیں۔

یہاں ایک وضاحت ضروری ہے، یہ محض ایک علمی بحث ہے جس کا آج کے حالات سے کوئی تعلق نہیں ہے، بات اس وقت کی ہو رہی ہے جب مسلمان ہندوستان میں شروع میں وارد ہوئے تھے، آج کے حالات کا تقاضا دوسرا ہے اور مسلمانوں کے تشخص کے پیش نظر اس وقت اپنی موجودہ روش پر قایم رہنا بلکہ اسے مستحکم تر کرنا ازبس ضروری ہے۔

اخبار علمیہ

ایتھوپیا میں دو آدمیوں اور ایک بچے کی کھوپڑیاں برآمد ہوئی ہیں جو غالبًا ایک لاکھ ساٹھ ہزار سال پرانی آثار متحجرہ کے دور کی ہیں، سائنس دانوں کا خیال ہے کہ انسانوں کے آباو اجداد کے اس طرح کے چہرے پہلی مرتبہ برآمد ہوئے ہیں، جن کے بیچ کا حصہ کشادہ لیکن ناک کی ہڈی لمبی اور تنگ ہے اور پیشانی نمایاں طور پر چھوٹی ہے، ان علامتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کھوپڑیاں اس دور کی ہیں جب انسان عالم نباتات میں تھا، افریقہ میں تقریبًا ایک لاکھ ۵۰ ہزار سال پرانی انسانی باقیات کی اس دریافت سے ابتدائی نسلِ انسانی کی کنہ وحقیقت جاننے کا موقع ہاتھ آیا ہے اور جدید علم تشریح الاعضاء کی مدد سے اس کے مقام وزمانہ کی تعیین بھی ہوسکتی ہے، چنانچہ یونیورسٹی آف کیلیفورنیا ایٹ برکلے سے وابستہ ماہر بشریات اور حفریات کی انٹرنیشنل ٹیم کے سربراہ ڈاکٹر ٹم، ڈی وہائٹ نے کہا ہے کہ اس دریافت کے بعد ہم اپنے قدیم آباواجداد کو براہِ راست سمجھ اور دیکھ سکتے ہیں، ان کھوپڑیوں کو دریافت کرنے والے اور دوسرے سائنس دانوں نے کہا کہ یہ تحقیق اس خیال کو طے کردے گی کہ انسان کا سراغ پہلے افریقہ میں لگا تھا اور پھر وہیں سے وہ یورپ اور ایشیا میں منتقل ہوکر ہر طرف پھیل گیا، دوسرے سائنس دانوں کے علی الرغم ڈاکٹر اسٹیر نگر کے نزدیک افریقہ کے باہر انسانی نسل کے ظہور وشیوع کا نظریہ زیادہ وزن دار ہے، کیوں کہ نوع انسانی کے وجود وخلقت اور شکل وشباہت کے اختلاف پر ہونے والی سالماتی تحقیق کے آغاز کے بعد ادھر دو دہائیوں میں متعدد ایسے ثبوت ہاتھ لگے ہیں جو افریقی نسل میں کسی ایک نقطہ اشتراک کی غمازی کرتے ہیں، اس سے افریقہ کے علاوہ دنیا کے کسی اور خطہ میں انسانی وجود کے امکانات بڑھ جاتے ہیں، واضح رہے کہ سائنس دانوں کی اس تحقیق کی بنیاد نظریہ ارتقا پر ہے۔ (ٹائمس آف انڈیا، نئی دہلی)

ماہرین علم الافلاک نے ۱۳؍بلین (۱) سال پرانا گیس والا ستارہ دریافت کیا ہے، ان کے مطابق یہ دریافت ان نظریات کو بدل دے گی جو ستاروں کے تشکیلی وتخلیقی ادوار کے متعلق قایم کیے گئے تھے، یہ ستارہ مشتری سے دوگنا سے بھی زیادہ بڑا ہے، سورج یا دیگر سیاروں سے کئی بلین برسوں پہلے جن مجموعی ستاروں نے کروی شکل اختیار کی تھی ان ہی ستاروں پر اس ستارے کا نظام بھی مشتمل ہے، کروی شکل اختیار کرنے والے تمام ستارے اپنی کروی شکل میں تقریبًا ایک ہی وقت میں وجود میں آئے اس لیے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ ستارہ بھی ان ہی ستاروں میں سے ہے، یونیورسٹی آف برٹش کولمبیا ان وینکاور، کینڈا سے منسلک ماہر علم الافلاک ہاروے، ریچر نے ناسا (NASA) کانفرنس کے موقع پر یہ خیالات ظاہر کیے، پلسر ایک نہایت تیزی سے گھومنے والا سیارہ جو تقریبًا ۱۵؍برس پہلے دریافت ہوچکا ہے اس کے بعد ماہرین علم الافلاک نے سورج جیسے قدیم ہائیڈروجن اور ہیلیم گیس والے ستارے بہت کم ہی دریافت کیے ہیں، ماہرین فلکیات کے مطالعے میں اب تک ہیوبل دوربین کے ذریعہ دیکھا گیا اس قسم کا کوئی ستارہ دریافت نہیں ہوا ہے۔

کارنج انسٹی ٹیوشن کے ایلن بوس نے کہا کہ یہ قدیم ستارہ حیرت ناک ووحشت انگیز ہے، پنسلوانیہ یونیورسٹی کے پروفیسر اسٹین سیگر ڈسن نے کہا کہ نظریاتی طور پر یہ ممکن ہے کہ ۱۲ء۵ بلین برسوں پہلے ان ستاروں نے مشکل صورت اختیار کی ہو لیکن جب نیوٹران سیارے کی کشش نے سورج کو اپنے مدار کی طرف کرلیا تو کئی ایک ستارے جو سورج کے قریب تھے ختم ہوگئے، صرف گیس والے بعض ستارے (جن میں ایک ستارہ یہ بھی ہے) دوری کے سبب رہ گئے، حال ہی میں دریافت شدہ یہ گیس والا ستارہ جو سورج سے تقریبًا ۲؍بلین دور چکر لگارہا ہے اپنا وجود قایم رکھ سکا، انہوں نے مزید کہا کہ ایک بلین سال پہلے متعدد ستاروں کا برباد ہونا تسلیم کیا جاچکا ہے، لیکن چوں کہ یہ ستارہ دس بلین سال پہلے کا ہے اور سورج سے انتہائی دوری پر ہے، اس لیے یہ برباد ہونے سے بچ گیا۔

(۱) ایک بلین دس کھرب کے برابر ہوتا ہے۔

ملیشیا میں ۱۱/جولائی ۲۰۰۳ء کو "مغرب سے مباحثہ" کے موضوع پر ایک انٹرنیشنل کانفرنس ہوئی جس میں مسلم اسکالرس نے اس پر دکھ اور افسوس ظاہر کیا کہ اسلام جیسے امن پسند مذہب کا تعلق دہشت گردی سے جوڑ دیا گیا ہے، انہوں نے انتہا پسندی اور تشدد کو فروغ دینے والی کتابوں پر پابندی لگانے کی تجویز بھی رکھی اور مغرب کو اس موضوع پر مباحثہ کی دعوت بھی دی، مصر کے ایک مسلم رہنما اور الجزیرہ کے شیخ گرانڈ نیز محمد سید طنطاوی وغیرہ نے جو عالم اسلام کے سنی مسلمانوں میں معتبر اور بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، کہا کہ مسلمانوں کی آغوش ایسے لوگوں کے لیے ہمیشہ وا رہتی ہے جو امن وسکون کے خواہاں اور معصوم لوگوں پر ہونے والی جارحیت اور تشدد کی پرزور مذمت کرتے ہیں، سید طنطاوی نے ۸۰۰/اسکالرس اور ۳۴/ملکوں سے آئے ہوئے غیر سرکاری مندوبین کو خطاب کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ مختلف العقاید لوگوں کو نفرت ومخاصمت کے بہ جائے آپس میں محبت اور صلح وآشتی سے رہنا چاہیے اور جہالت کو ختم اور علم وفن کو فروغ دینے میں ایک دوسرے کا تعاون کرنا چاہیے، سید طنطاوی نے کہا کہ میں تہذیبوں کے ٹکراؤ اور نظریاتی تصادم کا مخالف ہوں، انہوں نے پابندی لگائے جانے کے قابل کتابوں کی کوئی فہرست تو نہیں دی مگر بعض انتہا پسند مصنفین کی کتابوں کے حوالے ضرور دیے،

سہ روزہ کانفرنس کے اختتام کے بعد شرکا اور مندوبین نے مختلف امور پر باہم مذاکرات بھی کیے اور اپنے اپنے مذہب کے بارے میں غلط فہمیوں کا ازالہ کیا، لبنان کی اسلامک چیریٹی ایسوسی ایشن کے سربراہ شیخ حسین قرقرہ نے کہا کہ مخصوص حالات میں اسلام میں جنگ وجہاد کی اجازت کی بنا پر اسے تشدد اور انتہا پسند قرار دینا غلط ہے، اس سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں، انہوں نے اپنے مقالہ میں جو مندوبین میں تقسیم بھی کیا گیا نہایت پرزور انداز میں کہا کہ ہمیں ایسی طاقتوں کو روکنا ہوگا جو اسلام کی تبلیغ واشاعت کی راہ میں حایل ہیں۔

(ماخوذ، از ہندو، نئی دہلی)

ک، ص اصلاحی

مطبوعات جدیدہ

کتاب الفقہ علی مذہب الامام الاوزاعی: از ڈاکٹر قاضی زین الساجدین صدیقی، تقطیع کلاں، کاغذ وکتابت وطباعت، مناسب، صفحات ۲۴۷، پتہ: دائرۃ المصنفین، قاضی اسٹریٹ، میرٹھ اور فیکلٹی آف تھیالوجی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

امام ابوعمرو عبدالرحمان اوزاعی (م ۱۵۷ھ) کا شمار ائمہ فقہ کے طبقہ اولی میں ہوتا ہے، امام ابوحنیفہ نے بھی ان سے اکتساب فیض کیا، امام اوزاعی کے مکتب فقہ کو خاص طور پر شام میں قبول عام حاصل ہوا، وہاں اور اندلس میں قریب دوصدیوں تک ان کے مسلک پر عمل رہا لیکن بعد میں دوسرے، اور صاحب اجتہاد فقہا کے مسلکوں کی مانند یہ بھی متروک ہوا، شاید اسی وجہ سے امام صاحب کی شخصیت اور ان کے مسلک کے متعلق معلومات کا گوشہ تشنہ تر ہوتا گیا، ان کے ایک شاگرد ابومسہر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ صرف انہوں نے امام صاحب سے تیرہ کتابیں نقل کیں، لیکن اب فقہ اوزاعی کے متعلق کسی جامع کتاب کا کہیں سراغ نہیں ملتا، اس قابل ستایش کتاب کے لایق مولف کی توجہ اس اہم علمی ضرورت پر اس لیے بھی مبذول ہوئی کہ مستشرقین نے اس خیال باطل کو شدومد سے حق ثابت کرنا چاہا ہے کہ فقہ اوزاعی دراصل شام میں رائج رومی قانون سے مستفاد ہے اور اس کے توسط سے فقہ اسلامی کا سارا ذخیرہ رومی قانون سے متاثر ہے، اس افترا کا رد بھی مولف کے پیش نظر رہا، انہوں نے تلاش وجستجو کی سخت محنت سے حدیث کی شرحوں اور کتب فقہیہ میں منتشر امام صاحب کے اقوال وفواید کو جمع کیا اور اس کتاب کو ۲۸۷ ابواب کی شکل میں اس طرح مرتب کردیا کہ ہر مسئلہ میں امام صاحب کا مسلک مع دلیل آگیا، دوسرے فقہا کی رائیں بھی پیش کردیں کہ امام صاحب سے ان کے اتفاق و اختلاف کی وضاحت ہوسکے اور سب سے بڑھ کر یہ واضح ہوجائے کہ فقہ اوزاعی کا اصل مصدر و ماخذ قرآن وسنت اور اجماع وقیاس ہے، قول صحابی، عمل مدینہ اور یسر اور مقامی حالات و

مقتضیات کی رعایت اس فقہ کی خصوصیت ہے جو رومی قانون سے مستفاد نہیں اس طرح یہ کتاب فقہ اوزاعی سے واقفیت کے لیے عمدہ ماخذ بن گئی ہے، خوشی ہے کہ فقہ شام کی خدمت بھی ہند کے نصیب میں آئی البتہ کتاب کی شکل اور کتابت دونوں شایان شان نہیں، عربی میں پہلی سرخی الامام اوزاعی کی غلطی واضح ہے، اسی طرح جابجا شوکانی اور نووی لکھا گیا ہے۔

غالب اور ہماری تحریک آزادی: از جناب شمیم طارق، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۹۲، قیمت: ۲۰۰ روپے، پتہ: انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ دہلی، علی گڑھ اور اوسا، ۸- صابو صدیق پولی ٹیکنیک روڈ، ممبئی نمبر ۸۔

غالب کی شاعری کی عظمت جتنی مسلم ہے ان کی شخصیت اتنی ہی مابہ النزاع ہے، ان کے مداحوں اور نقادوں میں شروع سے یہ بحث رہی ہے کہ غالب آدمی تھے یا انسان، اسی بحث کا ایک پہلو ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی اور ہندوستان میں انگریزوں کے کید و مکر اور ظلم و جبر کی استعماری سازشوں کے بارے میں غالب کا فکری و عملی رویہ ہے، زیرنظر کتاب اسی سلسلۂ بحث کا حصہ ہے جس میں قوم و وطن کے آئینے میں غالب کی اس شخصیت کو دیکھا گیا ہے، جس کو محض اپنی آسایش اور عزت و رتبہ کی خواہش عزیز تھی اس کے لیے وہ اپنوں کی آزادی اور غیروں کی غلامی کے احساس سے بیگانہ ہوگئے، دامن خیال کو مضامین غیب سے آراستہ کرنے کی صلاحیت کے باوجود انہوں نے آشوب شہر کے کرب اور مستقبل کے انقلاب کی دستک محسوس نہیں کی، فاضل مصنف نے اسی اجمال کی تفصیل دو ابواب میں آزادی کی تحریک اور غالب کا عہد کے عنوان سے پیش کی، اتمام حجت کے لیے یہ تحریریں کافی تھیں لیکن سرسید اور غالب، دستنبو، خطوط اور قصاید میں موجود غالب کی ہر متعلقہ تحریر بھی بطور دلیل پیش کردی گئی ہے، یہ پوری بحث جدید اور انوکھی نہ ہونے کے باوجود دیدہ ریزی، ژرف نگاہی اور جذبے کی سچائی کی وجہ سے مدلل اور موثر ہوگئی ہے، مولانا فضل حق خیرآبادی کے ذکر اور ان کے قصاید الثورۃ الہندیہ اور قصیدۂ ہمزیۂ دالیہ کی موجودگی کم دلچسپ نہیں، جس میں اس رائے پر صاد کیا گیا ہے کہ ان کے فتوائے جہاد کی غلط تشہیر کی گئی اور یہ کہ مولانا کا ظاہری تعلق گرچہ انگریزوں سے تھا لیکن ان کا دل مجاہدین حریت کے لیے تڑپتا رہا، برسوں پہلے حکیم محمد احمد برکاتی نے اپنے مختصر لیکن وقیع رسالے میں ظاہر کیا تھا کہ

مولانا خیرآبادی نے انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے کسی بھی ممکن قربانی سے دریغ نہیں کیا تھا، یہ محاکمہ بھی محل بحث ہے کہ غالب کے برخلاف سرسید کے پیش نظر ذاتی مفاد سے زیادہ ملی مفاد تھا، سرسید کے بعض خیالات کی توجیہ بھی زیادہ قوی نہیں، یہ درست ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد غالب کی سخن گوئی، کیف و کم میں پہلے جیسی نہیں رہی، غالب کی مفاد پرستی کی تکرار کے باوجود مصنف کو اوروں کی طرح غالب شکن یا استہزاء و تنقیص کا مرتکب نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ ان کا عقیدہ ہے کہ غالب دنیائے شعر و ادب میں ہر طرح سے غالب ہیں، ان کی شاعرانہ عظمت کا انکار خود کو بے وقعت کرنے کے مترادف ہے۔

عبدالقوی دسنوی ایک مطالعہ: از ڈاکٹر محمد نعمان و جناب کوثر صدیقی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۵۰۸، قیمت: ۳۵۰ روپے، پتہ: دبستان بھوپال، ۸-۷۹، زیب ولا، گنوری مین روڈ، بھوپال اور مکتبہ جامعہ، دہلی۔

پروفیسر عبدالقوی دسنوی، اردو کے معروف محقق و نقاد اور مقبول و محبوب استاد ہیں، دیسنہ بہار کی مردم خیز بستی ان کا مولد ہے لیکن ادب و تحقیق میں ان کی شہرت کی نسبت دار الاقبال بھوپال سے ہے، اس کے سیفیہ کالج کا شعبہ اردو جہاں ان کی پرخلوص اور انتھک محنت سے نیک نام ہوا وہیں دسنوی صاحب کو وہ گوشۂ چمن بھی مل گیا جس کے سایے میں انہوں نے غالب و اقبال و آزاد اور خود بھوپال پر بے شمار مضامین و تصانیف کے ذریعہ ماہر فن ہونے کا درجہ پالیا، ادبیات بھوپال میں ان کا تفوق اب ثابت ہو چکا ہے، مولانا آزاد کے متعلق ان کی کتاب کا ذکر ان صفحات میں آچکا ہے کہ اتنی جامع سوانح عمری اب تک نہ لکھی گئی تھی، مولانا آزاد کی تاریخ پیدایش کے تعین میں ان کی دیدہ دری کا اعتراف کرتے ہوئے پروفیسر ریاض الرحمن خاں شروانی کا خیال ہے کہ ''دسنوی صاحب کی متعین کردہ تاریخ ہی قابل تسلیم ہے''، بھوپال اور غالب اور اقبال اور دار الاقبال بھوپال کو اپنے موضوعات پر گویا سند کا درجہ حاصل ہے، پروفیسر گیان چند کی یہ سند بھی بڑی قوی ہے کہ ''قوی صاحب نے اردو ادب کو جتنا کچھ دیا ہے وہ یقیناً قابل قدر و تقلید ہے''، ضرورت تھی کہ ان کی سادہ و پاکیزہ شخصیت اور علمی و ادبی کاوشوں کا مکمل احاطہ کیا جائے، زیرنظر کتاب اس لحاظ سے واقعی جامع ہے کہ اس میں دسنوی صاحب

کے معاصرین، رفقا، احباب اور تلامذہ کی متنوع تحریریں یک جا کردی گئی ہیں جن سے ان کی زندگی کا قریب ہر گوشہ روشن ہوگیا ہے، ایک حصہ منظومات کے لیے وقف ہے اور آخر میں حیات نامہ کے عنوان سے ان کے شاگرد رشید و عزیز ڈاکٹر محمد نعمان نے نسب نامہ، سرگذشت اور تبصرے و مکتوبات وغیرہ جمع کردیے ہیں جن سے افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔

مولانا ابواللیث ندویؒ کے قرآنی مقالات: تدوین و تحقیق جناب عمیر منظر، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۱۲۰، قیمت: ۵۰ روپے، پتہ: نیو کریسنٹ پبلشنگ کمپنی، ۲۰۳۵، گلی قاسم جان، بلی ماران، دہلی-۶۔

مولانا ابواللیث ندوی سابق امیر جماعت اسلامی ہند کی للّٰہیت، تقوی اور بہترین انتظامی صلاحیت کا اعتراف عام ہے، انہوں نے ملک کی تقسیم کے بعد جماعت اسلامی کو اعتدال و توازن کے جس سانچے میں ڈھالا وہ معمولی کارنامہ نہیں، لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ مولانا کی علمی و تصنیفی صلاحیت جوان کا اصل جوہر تھی، جماعتی سرگرمیوں میں شایان شان ظاہر نہ ہوسکی، قرآنی علوم پر ان کی گہری نظر تھی، شروع میں انہوں نے کئی اہم تحریریں سپرد قلم کیں جو مختلف رسایل و جراید میں منتشر تھیں، ان کے جمع و تدوین کی ضرورت تھی جو زیر نظر کتاب کی شکل میں بخوبی پوری کی گئی، ترتیب اسمائے انبیائے کرامؑ، قصہ آدم و شیطان، تکرار مضامین، سجع، قصہ حضرت یوسفؑ توریت اور قرآن مجید کی روشنی میں وغیرہ ایسے مقالات ہیں جو فہم قرآن میں بہت مفید ہیں، مولانا نے بڑی خوبی سے واضح کیا کہ بعض قرآنی قصص، مطالب اور جملے مکرر معلوم ہوتے ہیں لیکن درحقیقت وہ ہر جگہ اپنے مخصوص معانی کے اعتبار سے بالکل مستقل اور نئے ہیں، قصہ حضرت یوسفؑ میں بعض آیتوں کے متعدد احتمالات کے متعلق مولانا لکھتے ہیں کہ ان میں اس احتمال کو قوی سمجھنا چاہیے جو توریت کے اس بیان کے مطابق ہو جو کسی عقلی یا نقلی دلیل کے مخالف نہ ہو مثلاً مفسرین عام طور پر عزیز کو ملک مصر سمجھتے ہیں لیکن توریت میں تصریح ہے کہ دونوں الگ الگ ہیں، قرآن مجید سے بھی ایسا ہی سمجھا جاتا ہے، مولانا کی ان تحریروں میں ان کے استاذ مولانا فراہی کے افکار کی جھلک ہے، اس لیے اس مجموعہ کو فکر فراہی کی توسیع کہنا غلط نہیں ہے۔

تجدید فکریات اسلام، علامہ اقبال کے انگریزی خطبات کا اردو ترجمہ: مترجم ڈاکٹر وحید عشرت، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۹۰، قیمت: ۲۰۰ روپے، پتہ: ۱۱۶- میکلوڈ روڈ، لاہور۔

علامہ کے مشہور انگریزی خطبات کا مقصد، اسلام کی فلسفیانہ روایات اور مختلف انسانی علوم میں جدید ترین تحقیقات کو مدنظر رکھ کر اسلام کے مذہبی فکر کی تشکیل جدید کرنا تھا، ان خطبات کی شہرت و مقبولیت محتاج بیان نہیں، ادق فلسفیانہ مضامین و اصطلاحات کی وجہ سے ان کا اردو ترجمہ آسان نہیں تھا تاہم وقتاً فوقتاً ترجمے ہوتے رہے لیکن خوب تر کی گنجایش بہر حال رہی، زیر نظر ترجمہ بھی اسی سلسلے کی ایسی کڑی ہے جس میں آسان اور بوجھل اصطلاحات سے پاک زبان کا التزام کیا گیا ہے، ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ترجمے کے لیے اس ایڈیشن کا انتخاب کیا گیا جو پروفیسر محمد سعید شیخ نے نہایت عالمانہ تحقیق سے مدون کیا تھا، فاضل مترجم کے خیال میں دوسرے مترجمین نے اس کو پیش نظر نہیں رکھا، یہ بھی کوشش کی گئی کہ ترجمے کی بجائے یہ طبع زاد کتاب معلوم ہو اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اب تک کے ترجموں میں یہ سب سے زیادہ آسان فہم اور اسلوب میں سلیس نظر آتا ہے۔

اردو شاعری میں ہندو تہذیب کی عکاسی: از جناب اثر انصاری، متوسط تقطیع، کاغذ و طباعت مناسب، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۴۲، قیمت: ۵۰ روپے، پتہ: نکھار پبلی کیشنز، ڈومن پورہ، مئوناتھ بھنجن، اور مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی۔

جناب اثر انصاری پختہ گو صاحب دواوین شاعر ہیں، نثر میں بھی کئی کتابیں ہیں، زیر نظر کتاب میں انہوں نے گنگا جمنی تہذیب کی نمایندہ اردو زبان کے اس شعری سرمایے پر توجہ کی ہے جس کا تعلق ہندو مذہب اور اس کے مظاہر و شعائر سے ہے، مقصد یہی ہے کہ اردو زبان کو ایک مذہب سے وابستہ کرنے والوں کو احساس ہو کہ اردو شاعری نے ہندو تہذیب کی خوبصورت عکاسی میں فرق اور بخل سے کام نہیں لیا، کرشن کنہیا اور رام، ہمالہ اور گنگا جمنا، برکھا، بسنت، راکھی، ہولی، دیوالی اور دسہرے پر بہترین شاعری سے اردو کا دامن معمور ہے، یہ کاوش واقعی پُراثر ہے کہ اس میں سو کے قریب نظموں کا انتخاب اور ان کا مختصر تعارف بھی ہے، یہ دل کش اور دلچسپ

مجموعہ اس لایق ہے کہ اس کو ہندی میں بھی شایع کیا جائے۔

وفیات مشاہیر بہار: از ڈاکٹر سید شاہد اقبال، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۹۴، قیمت: ۱۰۰ روپے، پتہ: آستانہ حق، روڈ نمبر ۱۰ (ویسٹ بلاک) نیو کریم گنج، گیا، بہار۔

فن تاریخ میں وفیات نویسی کا التزام و اہتمام، مسلمانوں کی قدیم علمی روایت کا نمایاں حصہ ہے، مشاہیر رجال کے سنینِ ولادت و وفات اور ان کے مختصر حالات دراصل کسی بھی قوم و ملک کی تاریخ نگاری کے لیے قیمتی خام مواد کی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، عربی اور فارسی سے منتقل یہ روایت اردو میں بھی جاری ہے، زیر نظر کتاب بھی اسی کا ایک حصہ ہے جس میں بہار کے ان مشہور اہل علم و فکر و ادب کا ذکر ہے جن کا انتقال ۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۹ء کے عرصے میں ہوا، قریب ساڑھے تین سو اشخاص کا حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب یہ اشاریہ نوجوان اور لایق مولف کی کوشش و کاوش کا نتیجہ ہے، کوشش یہی کی گئی ہے کہ یہ فہرست جامع ہو مگر پھلواری شریف کے شاہ نصر احمد پھلواروی کے نام کی کمی محسوس ہوتی ہے، بعض نام ایسے ہیں کہ کم لوگوں کو ان کے بہاری ہونے کا علم ہے مثلاً مشہور پاکستانی شاعرہ پروین شاکر، شروع میں فاضل گرامی پروفیسر مختار الدین احمد کے قلم سے وفیات نگاری پر بڑی جامع اور مفید تحریر ہے۔

نوائے صادق: از جناب سلیمان صادق مرحوم، مرتبہ جناب آفاق منظر ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۱۰۸، قیمت: ۶۵ روپے، پتہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی نمبر ۶ اور بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ نمبر ۴۔

اس مجموعہ کلام کے شاعر، بہار میں جماعت اسلامی کے مخلص و بے غرض کارکن تھے، سخن گوئی کی صلاحیت تھی لیکن یہ صرف ذوق طبع کی تسکین کے لیے تھی، نام و نمود کا ذریعہ نہیں، اس لیے یہ اشعار صرف بیاض تک محدود رہے، ۸۱ء میں حج بیت اللہ کے لیے گئے لیکن یہ سفر آخرت بھی ثابت ہوا، اب ان کے لایق خویش نے ان کی بیاض کو مرتب کر کے زیر نظر مجموعے کی شکل میں شایع کیا ہے، بامقصد اور پاکیزہ شاعری کے قدردانوں کے لیے اس میں سامانِ نشاط ہے۔

ع۔ص

علامہ شبلی نعمانیؒ کی تصنیفات

کتاب	مصنف	Pages	Rs
۱۔ سیرۃ النبیؐ اول (مجلد اضافہ شدہ کمپیوٹر ایڈیشن)	علامہ شبلی نعمانی	512	190/-
۲۔ سیرۃ النبیؐ دوم (مجلد اضافہ شدہ کمپیوٹر ایڈیشن)	علامہ شبلی نعمانی	520	190/-
۳۔ مقدمہ سیرۃ النبی	علامہ شبلی نعمانی	74	30/-
۴۔ اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر	علامہ شبلی نعمانی	146	85/-
۵۔ الفاروق (مکمل)	علامہ شبلی نعمانی	514	95/-
۶۔ الغزالی (اضافہ شدہ ایڈیشن)	علامہ شبلی نعمانی	278	120/-
۷۔ المامون (مجلد)	علامہ شبلی نعمانی	248	65/-
۸۔ سیرۃ النعمان	علامہ شبلی نعمانی	316	130/-
۹۔ الکلام	علامہ شبلی نعمانی	324	50/-
۱۰۔ علم الکلام	علامہ شبلی نعمانی	202	35/-
۱۱۔ مقالات شبلی اول (مذہبی)	مولانا سید سلیمان ندوی	236	65/-
۱۲۔ مقالات شبلی دوم (ادبی)	مولانا سید سلیمان ندوی	108	25/-
۱۳۔ مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	مولانا سید سلیمان ندوی	180	32/-
۱۴۔ مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	مولانا سید سلیمان ندوی	194	35/-
۱۵۔ مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	مولانا سید سلیمان ندوی	136	25/-
۱۶۔ مقالات شبلی ششم (تاریخی)	مولانا سید سلیمان ندوی	242	50/-
۱۷۔ مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	مولانا سید سلیمان ندوی	124	25/-
۱۸۔ مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری)	مولانا سید سلیمان ندوی	198	55/-
۱۹۔ خطبات شبلی	مولانا سید سلیمان ندوی	190	35/-
۱۹۔ مکاتیب شبلی (اول)	مولانا سید سلیمان ندوی	360	40/-
۲۰۔ مکاتیب شبلی (دوم)	مولانا سید سلیمان ندوی	264	35/-
۲۱۔ سفر نامہ روم و مصر و شام	علامہ شبلی نعمانی	238	80/-

۲۲۔ شعر العجم (اول ص 320 قیمت 50/-) (دوم ص 276 قیمت 70/-) (سوم ص 192، قیمت 35/-) (چہارم، ص 290، قیمت 45/-) (پنجم، ص 206، قیمت 38/-) (کلیات شبلی (اردو)، ص 124، قیمت 25/-)